مرگِ گُلرنگ

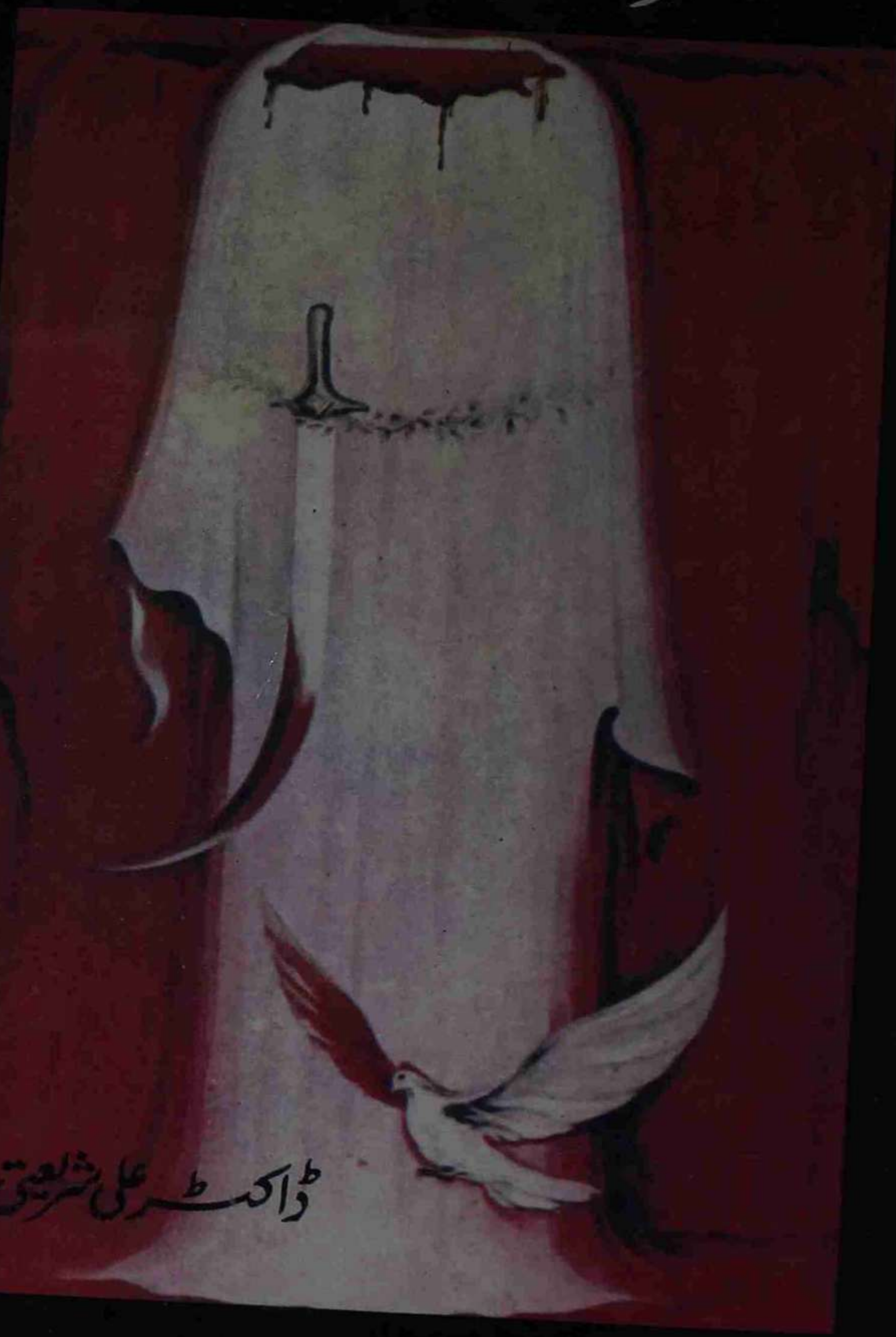

ڈاکٹر علی شریعتی

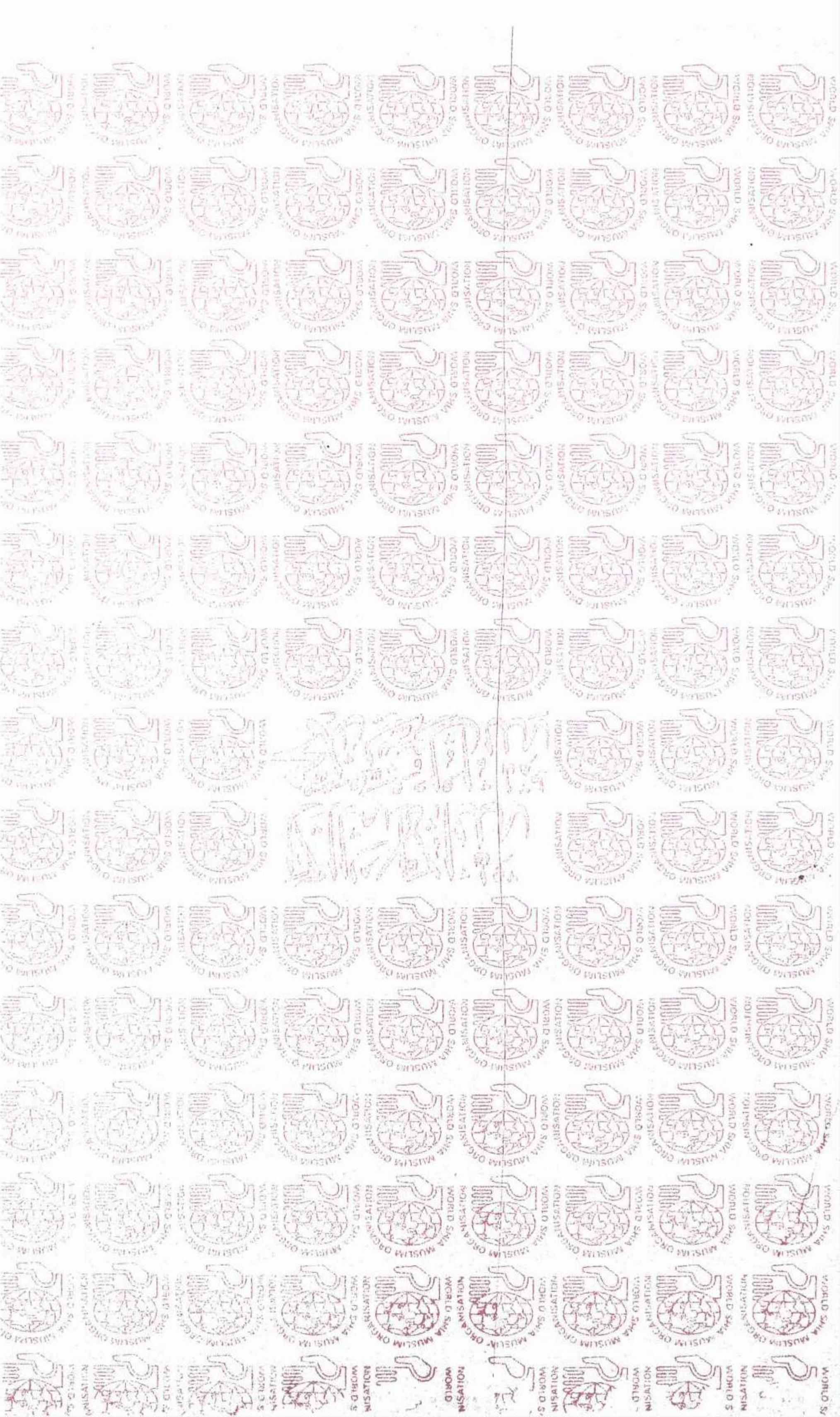
MUSLIM ORGANISATION
WORLD SHIA

WORLD SHIA MUSLIM ORGANISATION

مرگِ گلرنگ

ڈاکٹر علی شریعتی

عرضِ ناشر

کچھ عرصہ قبل ایران میں جو اسلامی اِنقلاب رونما ہوا ہے اس کا مکمل جائزہ لینا فی الحال قبل از وقت ہے کیونکہ اس کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے ان تمام عوامل کو مدِّنظر رکھنا ضروری ہے جو اس کی ابتداء، تدریجی ارتقاء اور آخری فتح کا موجب بنے۔ بہرحال اس بے نظیر انقلاب کا مطالعہ کرتے وقت جو چیز سب سے پہلے انسان کی توجہ جلب کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد اسلامی نظریے اور بالخصوص مکتبِ اہلِ بیتؑ پر رکھی گئی ہے۔ سیّد الشُہداء امام حسین علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق اہلِ بیتؑ کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی 'عقیدہ' اور 'جہاد' سے عبارت ہے۔

مکتبِ اہلِ بیت کی تشریح چند الفاظ میں کرنا ممکن نہیں۔

تاہم جہاد جو اس مکتب کا رکنِ اعظم ہے اس کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی جنگ کا نام ہے جس کا ایک اہم مقصد شہادت ہے اور اس مکتبِ فکر میں شہادت سے مراد ایک ایسا انتخاب ہے جو با مقصد، شعوری اور خود مختارانہ ہو۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

شہادت کے متعلق مختلف ادوار میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے تاہم ڈاکٹر علی شریعتی صاحب نے جس اچھوتے انداز میں اس کے مطالب اور معانی پر روشنی ڈالی ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مُقدّمہ

کربلا کی طرف مراجعت 'شہادت' کی طرف مراجعت ہے اور جن لوگوں نے شہادت دی انہوں نے اس وعدے کی شہادت دی جو 'روزِ الست' ہم سب نے خدا کے حضور کیا تھا جب اس نے پوچھا تھا:

اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ

کیا مَیں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟

اور ہم سب نے جواب دیا تھا:

بَلٰی شَہِدۡنَا

ہاں! ہم اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ تو ہمارا پروردگار ہے۔

(سورۂ اعراف - آیت ۱۷۲)

اس روز ہم نے بہ حیثیت بنی نوعِ انسان اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ قرار دیا تھا۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم زمین اور اس پر موجود مخلوقِ خدا

کی حفاظت کریں گے اور جو چیز اس کی مخلوق کی تباہی کا موجب ہوگی اس کے خلاف جہاد کریں گے۔

جہاں تک جہاد کا تعلق ہے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر ممکن طریقے سے ظالم لوگوں کے خلاف برسرِ پیکار رہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بعض لوگ تلوار سے لڑتے ہیں اور بعض لوگ زبان سے اور شہیدِ کربلا نے اس راہ میں شہادت کی پیشکش کی اور خدا نے اسے قبول کر لیا۔

قدیم شہر بابل کے قریب واقع کربلا کے میدان میں سنہ ۶۸۰ء میں امام حسینؑ اور ان کے اعزّہ اور اصحاب یزیدی افواج کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔

ائمۂ اہل بیت علیہم السّلام میں سے تیسرے امام، علیؑ و فاطمہؑ کے نورِ عین اور رسول اکرمؐ کے نواسے امام حسینؑ کو شاہِ شہیداں کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اسلام کی شہادت دے کر اپنی جان قربان کر دی۔

اموی بادشاہ معاویہ کے مرنے کے وقت آپ کی عمر تقریباً ۵۶ سال تھی اور آپ کی امامت شروع ہوئے دس سال ہو چکے تھے (امام حسینؑ نے امام حسنؑ کی شہادت پر امامت کا منصب سنبھالا جنہیں معاویہ نے زہر دلوا دیا تھا)۔

یہ دور امام حسینؑ کے لیے بڑا صبر آزما تھا اور انہیں طرح طرح سے پریشان کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر شریعتی نے بیان کیا ہے دینی احکام کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی تھی اور اموی حکومت کے قوانین مکمل طور پر مُسلّط کیے جا چکے تھے۔ معاویہ کی پوری کوشش تھی کہ امیر المومنین امام علیؑ اور اہلِ بیتِ رسولؐ کا نام و نشان مٹا دے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے بیٹے یزید

کی حیثیت بھی مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ حالات ایسا رخ اختیار کر چکے تھے کہ امام حسینؑ کو معاویہ کے ہاتھوں یہ تکالیف برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ جب معاویہ کے مرنے پر یزید مسندِ خلافت پر بیٹھا تو امام حسینؑ پر سخت گیری میں اضافہ ہو گیا۔

اِس مرحلے پر امام حسینؑ نے محسوس کیا کہ اُنہیں مدینہ چھوڑ کر مکّہ چلے جانا چاہیے کیونکہ یزید نے مدینہ کے گورنر کو لکھا تھا کہ امام حسینؑ کو بیعت پر مجبور کرے۔ اسلامی روایات کے مطابق ایک حکومت کی بقاء کے لیے بیعت ایک بڑی ضروری چیز تھی اور طاقتور عناصر کی بیعت کے بغیر کسی حاکم کا زیادہ عرصے تک برسرِ اقتدار رہنا ناممکن تھا۔ بیعت سے انکار کرنا جرم سمجھا جاتا تھا جس کی پاداش میں متعلّقہ شخص کو ذلیل و خوار کیا جاتا تھا۔ رسولِ اکرمؐ کی مثال سامنے رکھتے ہوئے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگر بیعت برضا و رغبت کی جائے اور اس کے حصول کے لیے کوئی جبر نہ کیا جائے تو وہ قدر و قیمت اور وقعت کی حامل ہے۔

معاویہ کو اس امر کا احساس تھا کہ اگر امام حسین علیہ السلام پر دباؤ ڈالا گیا تو معاملہ پیچیدہ اور سنگین ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی وصیّت میں یزید کو مشورہ دیا کہ وہ امام حسین علیہ السلام سے زبردستی بیعت حاصل کرنیکی کوشش نہ کرے۔ تاہم اس نے باپ کی وصیّت کو قابلِ اعتنا نہ جانا اور مسند نشین ہوتے ہی امامؑ کو بیعت کے لیے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ امام حسینؑ مکہ چلے گئے اور خانۂ خدا میں پناہ لی۔ وہ وہاں چار ماہ تک مقیم رہے اور اس دوران میں انہیں اسلامی دنیا کے کونے کونے سے خطوط اور عہد و پیمان وصول ہوئے جن میں ان سے ظالم اور جابر اموی حکومت کے خاتمہ کے لیے مدد دینے کی استدعا

کی گئی تھی۔ بالخصوص کوفہ کے لوگوں نے انہیں دعوت دی کہ ان کے پاس آکر رہیں اور وہاں اپنی حکومت قائم کریں۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں امام حسینؑ کے لیے مدینہ واپس جانے کا کوئی امکان نہ تھا کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو ایک ظالم اور ناجائز حکومت کی تصدیق کرتے اور اسلام کی کھلم کھلا توہین کے مرتکب ہوتے۔ کوئی ایسا فعل انجام دے کر وہ اسلام سے بے وفائی نہیں کر سکتے تھے حالانکہ بصورت دیگر ان کی موت یقینی تھی۔ کوفہ جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ وہاں کے لوگ مکمل طور پر قابلِ اعتماد نہیں تھے۔

امام حسین علیہ السلام نے آگے جانے کا فیصلہ کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی قسمت کا فیصلہ بھی کر دیا۔ انہوں نے کوفہ کا سفر اختیار کیا اور یہ سفر ایک ایسے مقام کی جانب تھا جہاں بیس سال قبل ان کے والد بزرگوار شہید کر دیے گئے تھے۔

امام علیہ السلام نے پہلے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا تاکہ وہاں کے حالات کا اندازہ لگائیں۔ شروع شروع میں کوفیوں نے حضرت مسلم سے عہد و پیمان کیے اور حمایت کا یقین دلایا۔ چنانچہ مسلم نے امام حسینؑ کو لکھ بھیجا کہ اہلِ کوفہ آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں۔ جب امامؑ کو اطلاع ملی تو وہ اپنے خاندان اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ کوفہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

دریں اثنا حضرت مسلم کی سرگرمیوں کی خبریں یزید تک پہنچیں اور وہ سخت پریشان ہوا۔ اس نے عبید اللہ ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر بنا کر بھیجا اور اسے حضرت مسلم کی سرکوبی کا حکم دیا چنانچہ حضرت مسلم عبید اللہ کے ہاتھوں

شہید ہو گئے۔

ابھی کوفہ پہنچنے کے لیے چند دن کا سفر باقی تھا کہ امام حسینؑ کو مسلم کی شہادت کی خبر ملی۔ یہ خبر اور خطرے کی دوسری اطّلاعات ملنے کے باوجود امامؑ نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور کوفہ کی جانب سفر جاری رکھا۔ انہیں یہ اطلاع بھی ملی کہ کوفہ کے تمام دروازوں پر محافظ تعیّنات ہیں اور ان کے لیے شہر میں داخل ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ تاہم انہوں نے کوفہ کی جانب یا دوسرے الفاظ میں اپنی موت کی جانب پیش قدمی جاری رکھی۔

بالآخر کوفہ سے تقریباً ستّر کیلومیٹر دور کربلا میں یزیدیوں نے امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ اس مقام پر آٹھ دن رہے اور اس دوران میں دشمنوں کی جانب سے محاصرہ تنگ ہوتا گیا اور ان کی تعداد دن بہ دن بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ تیس ہزار تک پہنچ گئی۔ دشمنوں نے ان کے لیے دریائے فرات کا راستہ مسدود کر دیا اور انہوں نے یہ دن شدید پیاس کے عالم میں گزارے۔

امام علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیا کہ وہ انہیں چھوڑ کر چلے جائیں کیونکہ اگر وہ اس مقام پر ٹھہرے رہے تو ان کی موت یقینی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ دشمن فقط میری جان کے درپے ہے اور میں اپنی بیعت تم پر سے اٹھا لیتا ہوں تاکہ تم جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔ تاہم ان حق و صداقت کے پروانوں نے کمال جرأتِ ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے امامؑ عالی مقام کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ روایات کے مطابق امام حسینؑ کی جانب سے بہتّر افراد نے معرکۂ کربلا میں حصہ لیا۔

۱۰ محرّم ۶۱ سنہ ہجری (بمطابق سنہ ۶۸۰ء) کو امام حسینؑ اپنی مختصر سپاہ

کے ساتھ دشمن کے سامنے صف آرا ہو گئے۔ جنگ صبح کے وقت شروع ہوئی اور سہ پہر تک جاری رہی۔ اس عرصے میں امام علیہ السلام اور آپ کے سب ساتھیوں نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

ساری دنیا میں بالعموم اور مکتبِ اہلِ بیتؑ کے پیروؤں کی زندگی میں بالخصوص کربلا کی گونج تیرہ سو سال سے سنائی دے رہی ہے۔ یہ وہ ناقابلِ فراموش واقعہ ہے جو روشن ضمیر شخص کے دل میں حق و صداقت کے دفاع کی خاطر شہادت کا جذبہ اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

ایک لحاظ سے شہادت یعنی "اُٹھنے اور گواہی دینے" کا تصوّر مکتبِ اہلِ بیتؑ میں کچھ یوں سما گیا ہے کہ اسے ایک ایسے شعار کا نام دیا جا سکتا ہے جو انسان کے دل میں 'مثلِ حسینؑ' بننے کا شوق اور جذبہ پیدا کرتا ہے کیونکہ ڈاکٹر شریعتی نے امام حسینؑ کی شخصیت کو جس انداز میں پیش کیا ہے اسے مدّ نظر رکھتے ہوئے "حسین بننا" فقط فرزندِ رسولؐ اور پروردۂ علیؑ و بتولؑ کا حصّہ ہے۔ بلاشبہ ع

حسینؑ بن کے دکھائے کوئی تو ہم جانیں

پہلا خطبہ

شہادت

آج میرے لیے شہادت کے موضوع پر تقریر کرنا قدرے مشکل ہے کیونکہ آج یومِ عاشورا ہے ـــــ امام حسینؑ کی شہادت کا دن ۔

امام حسینؑ کی شخصیّت اور ان کے تاریخ ساز کردار کے متعلق بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے اور بہت کچھ کہا اور لکھا جا رہا ہے ۔ مُتقدّمین نے امام حسینؑ کی شخصیّت اور کردار کو ایک انداز میں پیش کیا ہے اور تجدّد پسند متاخرین نے دوسرا انداز اپنایا ہے ۔ تاہم جیسا کہ حالیہ دنوں میں مجھے احساس ہوا ہے امام حسینؑ نے جو کارنامہ انجام دیا ہم اسے اس وقت تک پوری طرح نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ شہادت کے حقیقی معنی کیا ہیں؟

امام حسینؑ کی عظمت، ان کی شخصیّت کی تابندگی اور ان کے بارے میں مختلف انفرادی آراء نے اُس چیز کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے جو خود امام حسینؑ سے بھی عظیم تر ہے اور خود ان سے عظیم تر وہ چیز ہے جس کی خاطر وہ

قربان ہوئے۔ ہم ہمیشہ امام حسینؑ کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس مقصد کا تذکرہ شاذ ہی زبان پر لاتے ہیں جس کی خاطر انہوں نے اپنا سب کچھ نثار کر دیا۔

آج میرا ارادہ اس قربانی کے تصوّر کے بارے تقریر کرنے کا ہے جو حسینؑ اور حسینیوں نے دی اور میں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ ان قربانیوں کی انسانی تاریخ میں عموماً اور خود ہمارے مذہب میں کیا اہمیّت ہے۔

پس میں خدا اور اس کی مخلوق کے حضور میں اس تصوّر یعنی "شہادت" کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ـــــ جس کی تفسیر ان حضرات کی زندگی اور موت کی مجموعی کیفیّت سے ہوتی ہے ـــــ اور اس کے معانی بیان کرنا چاہتا ہوں۔

یہ ایک دشوار کام ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اس قدر علم اور ذہنی استعداد نہیں رکھتا کہ اس مشکل فریضے سے عہدہ برآ ہو سکوں اور (کم از کم جہاں تک میرا تعلق ہے) اس مسئلے کا متناقض نقشہ میرے کام کو اور زیادہ دشوار بنا دیتا ہے۔

ایک طرف تو ضروری ہے کہ میں شہادت کو فکری، علمی اور فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے پیش کروں۔ اس مقصد کے لیے مَیں صرف اپنا دماغ استعمال کر سکتا ہوں اور فقط علم اور منطق سے مدد حاصل کر سکتا ہوں۔

اور دوسری طرف شہادت کی داستان اور جس چیز کی شہادت دعویدار ہے وہ اس قدر حساس اور ولولہ آفریں ہے کہ انسان کی روح میں ایک آگ سی لگا دیتی ہے۔ وہ منطق کو مفلوج اور قوّتِ گویائی کو کمزور کر دیتی ہے حتیٰ کہ سوچنے کے عمل کو بھی مشکل بنا دیتی ہے۔ شہادت لطیف محبّت اور عمیق اور پیچ در پیچ عقل کی آمیزش ہے۔ انسان کے لیے ان دونوں کا اظہار بیک وقت ممکن نہیں اور نتیجے کے طور پر ان سے انصاف نہیں کر پاتا۔

بالخصوص مجھ جیسے شخص کے لیے جو جذباتی اور نفسیاتی لحاظ سے کمزور ہے یہ کام اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ تاہم میں کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں اس کے اظہار میں کسی نہ کسی حد تک کامیاب ہو جاؤں گا۔

"شہادت" کے معنی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس مکتبِ فکر کا تعین کر لیا جائے جس سے یہ لفظ اپنے معنی، طرزِ اظہار اور اقدار حاصل کرتا ہے۔ یورپی اور مغربی زبانوں میں MARTYR (شہید) اسے کہا جاتا ہے جو دشمن کے مقابلے میں اپنے اعتقادات کا دفاع کرنے کے لیے موت کا انتخاب کرے اور اس کے لیے مر مٹنے کے علاوہ اور کوئی راہِ عمل باقی نہ ہو لیکن "شہادت — اٹھو اور گواہی دو" کے الفاظ جو اسلامی تہذیب میں اس شخص کو متعین کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں جس نے موت کا انتخاب کیا ہو۔ مغربی دنیا کے لفظ MARTYRDOM سے بالکل مختلف معانی کے حامل ہیں۔ اس سے اسلامی اور غیر اسلامی اعتقادات میں فرق کا پتا چلتا ہے۔

یورپی زبانوں میں MARTYR کا لفظ MORTAL سے مشتق ہے، جس کے معنی 'موت یا مرنے' کے ہیں۔ تاہم اسلام اور بالخصوص مکتبِ اہلِ بیت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "قربانی دو اور شہادت یعنی گواہی دو" اور اس بنا پر MARTYRDOM یعنی 'موت' کی بجائے اسلام میں شہادت کے معنی 'زندگی' LIFE 'گواہی' EVIDENCE اور "تصدیق" TESTIFY یا CERTIFY کے ہیں۔ پس MARTYRDOM اور "شہادت" (گواہی دینا) کے الفاظ مکتبِ اہلِ بیت کی اسلامی تہذیب اور دنیا کی دوسری تہذیبوں کے زاویہ ہائے نگاہ کا فرق واضح کرتے ہیں۔

لہٰذا 'شہادت' کے معنی سمجھنے کے لیے انہیں متعلقہ مکتبِ فکر کے سیاق وسباق میں تلاش کرنا ضروری ہے اور بالخصوص اس مکتبِ فکر کا مطالعہ لازم ہے جس کا غیر معمولی مظہر امام حسین علیہ السلام ہیں۔ تاریخ انسانی کی پیشرفت اور تگ ودو میں امام حسین علیہ السلام علمبردار کی حیثیت رکھتے ہیں اور کربلا کا میدانِ جنگ ابتدائے تاریخ سے اب تک مختلف محاذوں، نسلوں اور زمانوں کو باہم مربوط کرنے کا واحد ذریعہ رہا ہے اور اس کی یہ حیثیت آئندہ بھی برقرار رہے گی۔

"حسینؑ" کے معنی اس وقت واضح ہوتے ہیں جب ہم ان کا تعلق ان تحریکوں سے سمجھ لیں جو تاریخی اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوتی ہیں۔ اس معنی کی وضاحت ضروری ہے اور جو انقلاب امام حسینؑ نے برپا کیا اس کی تعبیر اسی کی روشنی میں کرنی چاہیے۔

حسینؑ اور معرکۂ کربلا کو تاریخی اور سماجی حالات سے الگ کر کے دیکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اسے ایک ابدی اور غیر معمولی مظہر سمجھنے کی بجائے کئی ایک لوگوں کی طرح اس بات پر مجبور ہو جائیں کہ متعلقہ شخص اور واقعے کو زمانۂ ماضی کا ایک المیہ نہیں تو محض ایک ناخوشگوار واقعہ قرار دیکر اس پر فقط آنسو بہاتے رہیں (جیسا کہ بلاشبہ ہم بہاتے رہتے ہیں)۔ حسینؑ اور کربلا کو ان کے تاریخی اور نظریاتی سیاق وسباق سے جدا کرنا اس عمل کے مترادف ہے کہ ایک زندہ موجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے اور فقط ایک ٹکڑا لے کر اس کا تجزیہ کیا جائے جبکہ زندہ جسم کی پوری ساخت اور مکمل نظام کو نظر انداز کر دیا جائے۔

پیغمبروں کی دو قسمیں

تاریخِ انسانی میں جتنی مذہبی اور ان سے وابستہ سماجی تحریکیں

چلائی گئی ہیں ان کے رہبروں کو خواہ وہ اپنے پیغمبری کے دعوے میں سچے ہوں یا جھوٹے دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

پیغمبروں کے پہلے گروہ کا تعلق مذہب کے اس سلسلے سے ہے جس کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی۔ تاریخی اعتبار سے اس سلسلے کے پیغمبر ہم سے زیادہ قریب ہیں اور ہم ان کے بارے میں زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ یہ پیغمبر وہ تھے جنہوں نے معاشرے کے بارے میں اپنے نظریات کی بنیاد سماجی اور معاشی لحاظ سے محروم لوگوں کے حالات پر رکھی۔ جیسا کہ تاریخ سے پتا چلتا ہے اور رسولِ اکرمؐ نے بھی اس بات کی تصدیق فرمائی ہے۔ یہ سب پیغمبر یا تو گلّہ بانی کرتے تھے اور بھیڑیں چَراتے تھے یا محنت کر کے روزی کماتے تھے۔

ان کے علاوہ ایک دوسرا گروہ ہے جس میں چین، ہندوستان، ایران اور یونان کے عقلی، علمی اور اخلاقی مکاتبِ فکر کے بانی شامل ہیں۔ اس گروہ میں شامل تمام اشخاص بلا استثنا اشراف کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

ابتدائے تاریخ سے تین طبقوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص نے معاشرے پر حکومت کی ہے یعنی طاقتور طبقہ، دولت مند طبقہ اور مذہبی طبقہ۔ یہ تینوں طبقے مِل جل کر اور ایک دوسرے سے تعاون کر کے لوگوں پر حکومت کرتے رہے ہیں اور ان پر اپنا سیاسی، معاشی اور دینی تسلّط برقرار رکھا ہے خواہ ان کے خیالات میں اختلاف ہی کیوں نہ رہا ہو۔ انہوں نے لوگوں پر حکومت کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے تعاون کیا ہے۔

ابراہیمی سلسلے کے پیغمبروں کو چھوڑ کر ہند چینی سے لے کر یونان تک جتنے بانیانِ مذہب اور مفکّرین گزرے ہیں ان سب کا تعلق ماں کی طرف سے یا باپ کی طرف سے یا دونوں جانب سے شہنشاہوں، دینی پیشواؤں اور امراء سے تھا۔

یہ قول کنفیوشس (Confucious) لاؤتزو (Laotzu) گوتم بدھ (Buddha) زرتشت (Zoroaster) مانی (Mani) مزدک (Mazdak) سقراط (Socrates) افلاطون (Plato) اور ارسطو (Aristotle) پر صادق آتا ہے۔

تاہم قرآن مجید فرماتا ہے :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

اللہ نے ایمان والوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے واسطے انہیں میں سے ایک رسول بھیجا۔ (سورۂ آلِ عمران - آیت ۱۶۳)

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے ابراہیمی سلسلے کے پیغمبر عوام میں سے ابھرے تھے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عام لوگوں کی طرح ملکوتی صفات سے عاری تھے یا انہیں کوئی اختیارات حاصل نہ تھے اور وہ محض عام انسان تھے اس سے فقط یہ مراد ہے کہ انہیں عوام الناس میں سے منتخب کیا گیا تھا اور ان کا تعلق امراء اور اشراف کے مخصوص طبقے سے نہیں تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ پیغمبر اسلامؐ عربوں میں سے اٹھے تھے اس لیے انہیں عربی بولنی چاہیے تھی اور چونکہ حضرت موسیٰؑ یہودیوں کے لیے مبعوث ہوئے تھے اس لیے انہیں عبرانی بولنی چاہیے تھی۔ ظاہر ہے کہ جب رسالت کے لیے آنحضرتؐ کا انتخاب عربوں میں سے کیا گیا تو انہیں عربی زبان ہی بولنا تھی۔

اہم بات یہ ہے کہ عام لوگوں کی زبان بولی جائے اور محاورہ اور روزمرہ کا استعمال اس انداز میں کیا جائے کہ عوام کے لیے قابل فہم ہو۔ ان کی ضروریات اور تکالیف کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا جائے جنہیں وہ سمجھ سکیں

نہ کہ ایسی زبان میں جو فلسفی، شاعر اور دانشور استعمال کرتے ہوں کیونکہ یہ لوگ نہ تو عوام کے خیالات اور احساسات کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی باتیں عوام کی سمجھ میں آتی ہیں۔ یہ صورتِ حال اب بھی ہر جگہ دیکھنے میں آتی ہے۔ جب ہم ابراہیمی سلسلے کے پیغمبروں کا ذکر کرتے ہیں تو دراصل ہم عوام الناس کا ذکر کرتے ہیں کیونکہ ان پیغمبروں کا مشن پیغمبروں کے دوسرے گروہ سے قطعاً مختلف تھا۔ غیر ابراہیمی پیغمبر ہمیشہ برسرِ اقتدار طبقے سے وابستہ رہتے تھے تاکہ وہ ان کے خیالات کی تائید کرے۔ اس کے برعکس ابراہیمی سلسلے کے پیغمبروں کو جابر حکامِ وقت کے خلاف عوام کی تائید حاصل رہتی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کے حالات پر نظر ڈالیے۔ جونہی اللہ تعالےٰ نے انہیں رسالت پر مبعوث فرمایا انہوں نے گُرز سنبھالا اور بتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنا چوپانی کا عصا ہاتھ میں پکڑا اور فرعون کو لرزہ براندام کر دیا۔ انہوں نے دولتمند اور با اقتدار قارون کو زمین میں دفن اور فرعون کو سمندر میں غرق کر دیا۔ پیغمبر اسلام نے پہلے نفس کے ارتقا اور پختگی کا دور گزارا اور پھر روحانی تحریک کی ابتدا کی۔ انہوں نے دس سال میں ۶۵ جنگیں لڑیں یعنی اوسطاً ہر پچاس دن میں ایک دفعہ مخالفین کا مقابلہ کیا۔

ابراہیمی سلسلے کے پیغمبروں کے معجزے بھی ان کی رسالت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جادوگری کا خاتمہ کرنے اور فرعون کے تخت پر حملہ کرنے کی غرض سے عصا کو اژدھا کی شکل میں استعمال کیا گیا۔

قرآن مجید واضح الفاظ میں فرماتا ہے کہ اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے کیونکہ درحقیقت دنیا میں فقط ایک الہامی مذہب نافذ رہا ہے اور ہر زمانے کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر پیغمبر کو ان کے مطابق اس مذہب کی ترویج

"دنیا میں فقط ایک مذہب ہے اور اس کا نام 'اسلام'
یعنی اطاعت ہے۔"

یہ اعلان کر کے ایک پیغمبرِ دین اسلام کو ایک آفاقی اور تاریخی شکل میں پیش کرتا ہے۔ وہ اسلامی تحریک کو ان دوسری تحریکوں سے وابستہ کر دیتا ہے جو تاریخ میں لوگوں کو آزاد کرانے کی خاطر چلائی گئیں اور ان کے نتیجے میں لوگ طاقتور، دولتمند اور استحصالی قوتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس طرح انہوں نے تمام عالمِ انسانیت کی تاریخ کے دوران ایک نقطۂ نگاہ، ایک روحانی جدوجہد، ایک عقیدے، ایک سرشت اور ایک نصب العین کا مظاہرہ کیا۔

آیئے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت پر غور کریں اور اس کا تاریخی سیاق و سباق سمجھیں اور جن الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے ان پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ قرآن مجید کس طرح تاریخی پس منظر بیان کر کے ان تحریکوں کو یکے بعد دیگرے جگہ دیتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ۔ (سورۂ آلِ عمران۔ آیت ۲۱)

بے شک جو لوگ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں اور ناحق پیغمبروں کو قتل کرتے ہیں اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو انہیں انصاف کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

جیسا کہ ظاہر ہے اس آیت میں تین نکات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ پہلا نکتہ اللہ کی آیتیں ہیں، دوسرا نکتہ پیغمبر ہیں اور تیسرا نکتہ وہ لوگ ہیں جو کفار کو انصاف کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ پیغمبروں اور انصاف پسند لوگوں کو ایک سطح پر رکھا گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قسم کا سماجی تصادم،

تاریخِ انسانی کا فلسفہ اور سابقہ تحریکیں قرآن مجید میں کس انداز سے بیان کی گئی ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید نے متعدد مرتبہ بتایا ہے کہ تاریخ کے ہر مرحلے پر پیغمبر، دینِ اسلام کی ترویج کے لیے مبعوث ہوئے اور پیغمبرِ اسلامؐ اس دین کے آخری رسولؐ ہیں۔ ان پیغمبروں کا پیغام عقل و دانش، کتاب اور آفاقی عدل پر مشتمل تھا۔ پیغمبر اسلامؐ نے لوگوں کو اسلام کی انسانی تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی اور خدائے واحد کی پرستش کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ سب دوسروں کی اطاعت اور غلامی سے نجات پائیں۔

پیغمبرِ اسلام توحیدِ الٰہی کے آفاقی عقیدے کی تائید کے لیے تشریف لائے اور ان کی بعثت کا مقصد یہ بھی تھا کہ تاریخ انسانی یعنی تمام نسلوں، قوموں، گروہوں، خاندانوں اور سماجی طبقوں میں یگانگت اور ہم آہنگی پیدا کریں اور اس نفاق کا قلع قمع کر دیں جو مشرکانہ مذاہب نے پیدا کر دیا تھا۔ "وحدت اسلامی" کا شعار ایک ایسا شعار تھا جس نے انسانوں کو آزادی بخشی۔ اس سے پیشتر کہ ذی فہم، پڑھے لکھے لوگ اور فلسفی اس شعار سے آگاہ ہوں غلاموں، مظلوموں اور غریبوں کو اس کا پتا چل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ مکہ میں رسولِ اکرمؐ کے ارد گرد جمع ہوئے ان کی اکثریت کا تعلق معاشرے کے محروم، مفلوک الحال اور بے کس طبقے سے تھا۔ آنحضرتؐ کو ان کے مخالفین تنقید کا نشانہ بھی بناتے تھے۔

موجودہ دور میں یہ چیز اس تحریک کے لیے بڑی قابلِ تعریف سمجھی جاتی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ فی زمانہ بدھ مت کے تمام پیشواؤں کا تعلق چین اور ہندوستان کے اشراف کے طبقے سے ہے۔ موجودہ دور میں اقدار بدل گئی ہیں!

یہی وجہ تھی کہ ان غلاموں کے لیے جنہوں نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا کہ غلامی

ان کا مقدّر ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی تعلیمات ایک خوشگوار موڑ ثابت ہوئیں۔ مذہب سائنس، فلسفے، زمانے، شاعری اور فن سبھی نے غلاموں کو یقین دلادیا تھا کہ ان کی قسمت میں اپنے آقاؤں کی خدمت کرنا لکھا ہے اور وہ پیدا ہی اس لیے کیے گئے ہیں کہ دکھ سہیں، بھاری بوجھ اٹھائیں اور بھوکے رہیں تاکہ دوسرے ان کی محنت کے نتیجے میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں۔

محروم طبقے جو خدا یا خداؤں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ انہیں دنیا کا کاروبار چلانے کے لیے تلی کے طور پر پیدا کیا گیا ہے تاکہ وہ بوجھ اٹھاتے رہیں اور لوگوں کے کاموں کی تکمیل میں ان کی مدد کرتے رہیں۔ اسی بنا پر روشنی اور اندھیرے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے مانی نے کہا ہے کہ:

"بدبخت اور مغلوب لوگ اندھیرے کے جوہر سے پیدا ہوئے ہیں اور فتح پانے والے لوگ روشنی کے جوہر سے پیدا ہوتے ہیں"۔

ارسطو اور افلاطون نے جو نابغۂ دہر تھے کہا ہے کہ:

"خدا یا فطرت نے کچھ لوگوں کو غلام اور کچھ لوگوں کو آزاد پیدا کیا ہے تاکہ غلام معمولی کام انجام دیتے رہیں اور آزاد لوگوں کو اونچی چیزوں مثلاً اخلاقیات، شاعری، موسیقی اور تہذیب کی جانب توجہ دینے کا وقت مل سکے"۔

پیغمبرِ اسلامؐ کو اس لیے مبعوث کیا گیا تاکہ وہ اس تحریک کی تکمیل کریں جو طولِ تاریخ میں دھوکا بازی، جھوٹ، شرک اور اختلافات پیدا کرنے، نفاق، آمریت اور طبقاتی نزاع کے خلاف چلائی جاتی رہی تھی۔ انہوں نے ان تمام خرابیوں کے خلاف جہاد کیا اور اعلان فرمایا کہ سب انسان برابر ہیں کیونکہ وہ سب خدا کی مخلوق اور آدمؑ کی اولاد ہیں۔ سب افراد کے لیے معاشرتی برابری

حاصل کرنے کے لیے وہ معاشی طور پر طاقتور طبقے کے خلاف بھی نبرد آزما رہے۔

مثال کے طور پر مدینہ کے مثالی معاشرے کو لیجیے جہاں بلال کو جو ایک حبشی غلام تھے، اشرافِ عرب سے زیادہ قابلِ تعظیم سمجھا جاتا تھا اور سبھی انکے اعلیٰ رتبے کے قائل تھے۔ حُذیفہ کے غلام نے جو کسی زمانے میں ذلیل اور محروم انسان کی حیثیت سے شہر کی تنگ گلیوں میں گھوما کرتا تھا اسلام کی بدولت اتنی عزت پائی کہ عربوں، یہودیوں اور قریش سمیت مدینہ کے سب شہریوں نے ایک بھائی کی حیثیت سے اس کا استقبال کیا اور جب وہ مسجد قبا میں عالی رتبہ قریشی مہاجرین کے آگے نماز پڑھانے کھڑا ہوا تو سبھی نے اس کی اقتدا کی۔

جب رسولِ اکرمؐ نے دورِ جاہلیت کی قدروں اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تو یہ سب جھوٹی قدریں نابود ہو گئیں۔ انہوں نے لوگوں کو حکم دیا کہ اپنے لمبے چوڑے لباس اور لمبی ڈاڑھیوں کو مختصر کریں کیونکہ یہ امارت کی نشانیاں تھیں۔ انہوں نے گلیوں میں متکبّرانہ انداز سے اکڑ کر چلنے سے بھی منع فرمایا۔ انہوں نے یہ حکم بھی دیا کہ ایک گھوڑے پر بیک وقت دو افراد سوار ہوا کریں۔ بعض اوقات لوگوں کی نظروں میں امیرانہ اقدار کی نفی کرنے کی خاطر آپ زین کسے بغیر گدھے پر سواری کیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک ضعیف عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس نے آپ کی عظمت اور بزرگی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ اس قدر مرعوب تھی کہ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ آنحضرتؐ نے بڑی شفقت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:

"آپ ڈر کیوں رہی ہیں؟ میں تو ایک ایسی قریشی عورت کا

بیٹا ہوں جو بھیڑوں کا دودھ دوہا کرتی تھیں۔ آپ کس سے ڈر رہی ہیں؟"

جب یہ گلہ بان اور اللہ کے آخری رسولؐ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو حالات یکسر بدل گئے۔ آپ کی وفات کے فوراً بعد اختلافات رونما ہونے لگے۔ تاریخی واقعات نے ابتداء میں صحیح راستے سے زیادہ انحراف نہیں کیا اور مکتبِ اسلام اور تاریخ اسلام کے درمیان بہت کم بُعد پیدا ہوا لیکن رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد یہ فاصلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ یوں سمجھیے کہ جب دو خطِ مستقیم ایک زاویہ بناتے ہیں تو ابتداء میں ان کے درمیان فاصلہ بالکل برائے نام (مثلاً ایک سینٹی میٹر کا ہزارواں حصّہ) ہوتا ہے لیکن جوں جوں وہ خطوط بڑھتے جاتے ہیں فاصلہ زیادہ ہوتا جاتا ہے اور کئی کلومیٹر تک پہنچ جاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح تاریخ کا خط حقیقتِ اسلام کے خط سے بتدریج دور ہوتا گیا۔

انحرافات کا ظہور

یوں رسولِ اکرمؐ کی وفات کے بعد انحراف جو شروع میں بے حد قلیل تھا رفتہ رفتہ بڑھتا گیا اور لوگ بتدریج دیانتداری، سچائی اور عدالت سے دور ہوتے گئے حتیٰ کہ جب چودہ پندرہ سال بعد عثمان کا زمانہ آیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے تمام انقلاب دشمن عناصر کو جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے ایک مقناطیسی قطب کی مانند اپنی جانب کھینچ لیا اور اسلامی قوت اور تحریک کے مرکز میں جمع کر دیا۔ عثمان نے عہدِ جاہلیت کی ذہنیت اور اسلام کے انقلابی دور کے درمیان رابطے کا کام دیا۔ یہ رابطہ اس کی

خلافت کی شکل میں تھا جسے مردود اشرافیت کے ان ذلیل عناصر نے جو کسی نہ کسی طرح باقی رہ گئے تھے پُل کے طور پر استعمال کیا۔ انہوں نے ان عہدوں پر قبضہ جما لیا جو مہاجرین اور انصار کی روحانی جد و جہد کے نتیجے میں حاصل کیے گئے تھے۔

عثمان نے شگاف کو پاٹ دیا اور اشرافیت کے شکست خوردہ ذلیل ترین اور نیم مردہ کارندوں نے اس کی خلافت کے پل کو عبور کر لیا۔ انہوں نے وہ مقامات سنبھال لیے جو مہاجرین اور صحابۂ رسولؐ کے جہاد کی بدولت حاصل ہوئے تھے۔

بنی اُمیّہ نے جو اسلام کے بدترین دشمن تھے عثمان کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے آلۂ کار بنا لیا تھا۔ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ انہوں نے ان ضربات کا مداوا کر لیا جو انہیں رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں پہنچی تھیں بلکہ انقلاب کے ثمرات پر بھی قبضہ جما لیا۔

ساری اسلامی تاریخ میں ترقی کی راہ میں اس قسم کی رکاوٹیں یوں بار بار واقع ہوئی ہیں کہ یہ تقریباً ایک قاعدہ بن گیا ہے (اس سے لازمی قاعدہ مراد نہیں) کہ ایک انقلاب اپنے بچوں کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ تاہم عثمان نے انقلاب کے مخلص فرزندوں کو ہڑپ ہو جانے دیا۔ جن لوگوں نے شمشیر بکف ہو کر ایمان، فداکاری، اخلاص اور صبر کے ساتھ جہاد کیا تھا، ظالموں نے انہیں تباہ کر دیا اور طاقت، حکومت، لوگوں کے حقوق اور انقلاب کے ثمرات پر قابض ہو گئے۔ عثمان اور اس پر اثر و نفوذ رکھنے والے امویوں کا پہلا ہدف علی علیہ السلام کی ذات تھی جو باقیماندہ انقلاب دشمنوں کے ہاتھوں دورِ جاہلیت کی تجدید کا نشانہ بنے۔ علی علیہ السلام کی سیاسی، سماجی اور

بین الاقوامی حیثیت ایک نئی کشمکش کی عکاسی کرتی تھی۔ اس کشمکش میں ایک طرف تو نئی اقدار اور نئے ایمان کے علمبردار تھے جو نئے اور خالص اسلامی شعار کے ساتھ اٹھے تھے اور ان کے بالمقابل حرص کے بندے اور جاہلیت کے دستور کی تجدید کرنے والے بدترین عناصر تھے جنہیں بڑی تندہی سے مسلّط کیا جارہا تھا۔ ان غاصبوں نے نئی قوّت کے ساتھ علانیہ اور خفیہ طور پر اسلامی انقلاب کے بہترین افراد کے خلاف اپنی جدّوجہد شروع کر رکھی تھی۔

رسولِ اکرمؐ اس دور کی جدوجہد کے مظہر ہیں جس میں سچّے اور با ایمان مسلمانوں کا مقابلہ ان دشمنوں سے تھا جن کے متعلق معلوم تھا کہ وہ مسلمانوں کے مخالف ہیں لیکن امام علی علیہ السّلام اس دور کے مظہر ہیں جس میں باہمی کشمکش جاری تھی اور وفادار اور با ایمان اشخاص کا مقابلہ ان انقلاب دشمن عناصر سے تھا جنہوں نے دین کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔

جو مقابلہ رسولِ اکرمؐ اور ابوسفیان کے درمیان رہا وہ ایک بیرونی مقابلہ تھا اور ایک دشمن کے ساتھ تھا (ایک ایسے دشمن کے ساتھ جس نے ابنُ الوقتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس وقت اسلام قبول کیا جب اس نے دیکھا کہ اس میں مقابلے کی سکت باقی نہیں رہی)۔ اس کے برعکس امام علیؑ اور ابوسفیان کے بیٹے معاویہ کے درمیان مقابلہ ایک اندرونی مقابلہ تھا۔ یہ مقابلہ دین کے ایک دوست اور دوست نُما یا "اندرونی دشمن" کے مابین تھا جو بظاہر تحریکِ اسلام کی حمایت کر رہا تھا۔ غیر سرزمین پر جنگ اور بیرونی دشمن سے مقابلے میں فتح حاصل ہوئی لیکن اندرونی دشمن کے ساتھ داخلی جنگ کا نتیجہ شکست کی صورت میں نکلا۔ یہ وہ دشمن تھے جنہیں قرآن حکیم میں منافق کہا گیا ہے اور جو کافروں اور مشرکوں سے بھی بدتر تھے۔ لہٰذا رسولِ اکرمؐ ایک بیرونی

محاذ پر مکمل الحاد اور شرک کے خلاف اسلامی فتح کا مظہر ہیں جبکہ امام علیؑ اندرونی منافقین کے مقابلے میں شکست کا مظہر ہیں۔

اس نئی جہالت اور اشرافیت کے مقابلے میں جو سچائی کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی انقلاب کے اندر سے ابھری علی علیہ السّلام مدافعت کا قلعہ ہیں کئی سال تک علی علیہ السلام نے اس شرک کا مقابلہ کیا جس نے توحید کا لباس پہن رکھا تھا۔ انہیں ایک ایسے ملحد کا مقابلہ کرنا پڑا جس نے اسلام کی قبا پہن رکھی تھی اور (جنگ صفین میں) قرآن کو نیزوں پر چڑھا رکھا تھا۔ بالآخر علی علیہ السلام ایسے پارسا لیکن بے شعور لوگوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے جو عموماً ایک عیّار دشمن کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔

جب ہم وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کا حقیقی قلعہ رفتہ رفتہ کمزور ہو چکا ہے اور اس کے مقابلے میں نئی جہالت کے علمبرداروں اور اندرونی دشمنوں کی قوّت میں اضافہ ہو گیا ہے حتیٰ کہ ہم امام حسنؑ کے دور (یعنی ۴۰ ہجری مطابق ۶۶۰ میلادی) تک آ پہنچے ہیں۔

امام حسنؑ نے امام علیؑ کی حکومت کا نظم و نسق سنبھالا اور انہیں ایک ایسی فوج کی قیادت نصیب ہوئی جس میں منافقت کا مرض پھیل چکا تھا اور ان کے قریبی دوست بھی اس مرض سے متاثر ہو چکے تھے۔ ان کی فوج کے بہترین سردار دولت اور عہدوں کی خاطر معاویہ سے اپنے ایمان اور اخلاص کا سودا کر رہے تھے۔ انتظامی نقطۂ نگاہ سے امام حسنؑ کو اسلامی مقبوضات کے ایک بے حد طاقتور اور خطرناک حصّے یعنی شام پر کوئی اقتدار حاصل نہ تھا اور وہ سراسر دشمن کے قبضے میں تھا۔ عراق میں مختلف گروہ آپس میں دست و گریباں تھے۔ جاہ پسند لوگ علوی نظامِ حکومت کے وفادار نہیں ہو سکتے تھے۔ عوام النّاس

عدم توجہی کا شکار تھے اور انہیں کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

امام حسنؑ نئی اسلامی تحریک کے سب سے زیادہ محبوب، باخبر اور ترقی پسند ساتھیوں کا مظہر تھے اور خوارج جو ایک بے حد پُرجوش اور متعصب گروہ اور آبادی کی ایک خطرناک قوّت تھے ان کے مقابلے پر اتر آئے تھے چنانچہ منافقین پر مشتمل اندرونی دشمنوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی گئی حتیٰ کہ عدل پر مبنی اسلام کو ملوکیت پر مبنی اسلام سے بچانے کے لیے آخری جدوجہد کا تکلیف دہ اور پُرآشوب لمحہ آگیا۔ امام حسنؑ شکست کھا چکے تھے اور اب صلح کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ ایک شکست خوردہ فریق صلح کی شرائط کا تعین نہیں کرتا۔ امام حسنؑ شکستہ خاطر ہو چکے تھے۔

یوں امام حسنؑ کو جو انقلابی جدوجہد کی روح کا مظہر تھے ابھرتی ہوئی نئی جہالت کی مزاحمت سے دستبردار ہونا پڑا۔ انہیں ایک معمولی سپاہی کی طرح غیر مسلح کر دیا گیا۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے امام اور پیشوا کے گھر میں غداروں اور بنی امیہ کے جاسوسوں کا جال بچھا ہوا تھا اور جو لوگ امام علیہ السلام کے خوانِ نعمت کے پروردہ تھے وہ بھی ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ ان کی بیوی کو لالچ دے کر اس کے ذریعے انہیں زہر دلایا گیا اور وہ شہید ہو گئے۔

اس سے پتا چلتا ہے کہ لوگوں کی انصاف اور آزادی کی حس کس قدر کمزور ہو گئی تھی۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ جو لوگ ابھی تک مزاحمت کر رہے تھے اور اسلام کی مدافعت میں مصروف تھے ان کے پیشوا امام حسنؑ کی قوّت اس قدر گھٹ گئی کہ جب وہ فوت ہوئے تو مدینہ میں جو اُن کے نانا، والد اور والدہ کا شہر تھا اور مہاجرین اور انصار کا شہر بھی تھا انہیں ان کے نانا یعنی رسول اکرمؐ کے پہلو میں دفن کرنا بھی ممکن نہ ہوا اور بالآخر انہیں بقیع کے عوامی قبرستان میں

سپردِ خاک کیا گیا۔

خود مدینۃُ النبیؐ میں امام حسنؑ کے یوں اسلامی معاشرے سے کٹ کر تن تنہا رہ جانے سے اس امر کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ اسلام میں حق و صداقت کے شیدائیوں کی جماعت کو کس طرح تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ انقلاب کی نئی قوت ہر شخص اور ہر چیز پر مکمّل طور پر چھا گئی اور اس نے ہر علاقے کو مسخّر کر لیا۔ اب امام حسین علیہ السّلام کی باری آئی۔

اِمام حُسینؑ

جو تحریک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے شروع کی تھی وہ امام حسینؑ کو ورثے میں ملی۔ اسے اِمام علی علیہ السّلام نے جاری رکھا تھا اور امام حسنؑ نے اس کا آخری دفاع کیا تھا۔ فوج اسلحہ، دولت اور قوّت کی شکل میں امام حسین علیہ السلام کو کچھ نہیں ملا حتیٰ کہ پیروؤں کی جماعت بھی منظم نہیں تھی۔

اب ہم ۶۰ ہجری کے دَور تک آ پہنچے ہیں (قارئین سے گزارش ہے کہ آئندہ سطور غور سے پڑھیں کیونکہ انہیں کے مندرجات اس مضمون کا اہم ترین نکتہ ہیں)۔

ہر امام اس امر کا فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی آئندہ جدّ و جُہد کی صورت کیا ہو گی۔ اس معاملے میں امام کی ذاتی پسند کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ اسے ہر وقت کے تقاضوں اور دشمن کی قوّت کو مدِّ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ لہٰذا امام حسین علیہ السّلام نے اپنی جدوجہد کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا ہمارے لیے اسے سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم یہ نہ سمجھ لیں کہ ان کے قیام کے وقت حالات کیا تھے۔

جب امام حسین علیہ السلام کی باری آئی زمانہ اور لوگ ایک مردِ میدان کی جستجو میں تھے۔ ایسی صورتِ حال بڑی مشکل ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک قوم مذہب، نظریے معاشرے اور نسل کی قسمت اس چیز سے وابستہ ہو جاتی ہے کہ لوگ ایک فردِ واحد یا زیادہ افراد سے توقعات باندھ کر ان کا انتظار کریں۔

انقلاب کی حفاظت کی ذمہ داری امام حسینؑ کے کندھوں پر اس وقت آپڑی جب مدافعت کے آخری قلعے بھی ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ انہیں اپنے نانا، بھائی، اسلامی حکومت اور سچائی اور عدل کی علمبردار جماعت کی جانب سے عسکری قوّت کی شکل میں کوئی چیز حتیٰ کہ ایک سپاہی تک نہ ملا تھا۔

بنی اُمیّہ نے معاشرے کے ہر اہم نقطے پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ سالہا سال تک قریش اپنی نئی جہالت کے زیر اثر تمام اقدار پر مسلط رہے اور اسلامی انقلاب کے ثمرات سے اپنا دامن بھرتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی انقلاب کی جانب جھکاؤ میں کمی آگئی اور انقلاب کے پرانے مجاہد اور محمدؐ کے صحابی اور ان کے مکتب کے تربیت یافتہ اشخاص تین گروہوں میں بٹ گئے۔

سنہ ۶۰ ہجری تک صحابہ کا پہلا گروہ جو تحریک میں کسی قسم کی کجروی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور اس کی حفاظت کی خاطر جان قربان کرنے کو تیار رہتا تھا معدوم ہو چکا تھا۔ ابوذر، عمّار، عبداللہ ابن مسعود، میثم اور حُجر بن عدی میں سے کوئی بھی باقی نہیں بچا تھا۔

دوسرے گروہ میں وہ لوگ شامل تھے جو گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ اس مشکل دور میں جب سچے مسلمانوں نے نہ تو فتح پائی تھی اور نہ ہی شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے تھے بلکہ قید خانوں میں سختیاں برداشت کر رہے تھے۔ فداکاری کی شکل میں عبادت کی ضرورت تھی۔ تاہم ان لوگوں پر مشتمل گروہ نے ایک نئی راہ

ڈھونڈ نکالی۔ جہاد کے ذریعے میدان جنگ میں جنت تلاش کرنے کی بجائے انہوں نے اس کی جستجو زہد، مراقبے، طویل مدّت تک روزہ داری، نفس کُشی اور نفلی عبادات میں کی۔ اس گروہ کی سب سے بڑی مثال عبداللہ ابن عمر ہیں۔

یہ وہ لوگ تھے جو اِسلامی انقلاب کے دوران پروان چڑھے تھے اور جنہوں نے رسولِ اکرمؐ کے شانہ بشانہ اس انقلاب کی خاطر جدّوجہد کی تھی۔ لہٰذا جب بنی اُمیّہ کے کارندے عام مسلمانوں پر کوڑے برسا رہے تھے اور انہیں تلواروں سے قتل کر رہے تھے اور وہ بیکس لوگ ان کی جانب دیکھ رہے تھے کہ یہ اٹھیں اور ان کا دفاع کریں، ان حضرات کے لیے لازم تھا کہ اس ظلم وستم کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے لیکن انہوں نے مسجدوں کے کونوں میں بیٹھ کر زہد وعبادت میں مصروف رہنے میں پناہ ڈھونڈلی۔

کیا وہ لوگ بہترین مسلمان نہیں ہیں جو ایسے موقع پر قربانی دیں جب پارسا لوگ ظلم اور بے ایمانی کے کارندوں کے مقابلے میں پسپا ہو جائیں؟ بلاشبہ جو لوگ ان حالات میں مقابلے سے دستبردار ہو کر معاشرے سے دور مسجدوں کی محرابوں میں پناہ ڈھونڈیں ان کے ہاتھ جرم، جوانمردوں کے خون اور خود اپنے خون سے آلودہ ہوتے ہیں۔

ایک باشعور انسان اپنی ذمّہ داری محسوس کرتا ہے اور صحیح اور غلط کے مابین فرق کو پہچانتا ہے۔ اگر وہ ایسے موقع پر گوشہ نشین ہو کر عبادت میں مصروف ہو جائے تو یہ ایسے ہی ہوگا جیسے کہ اس نے ایک آزاد اور باشعور مجاہد کو ایک ظالم کے مفاد کی خاطر قربان کر دیا ہو اور یہ قربانی خود اس کی اپنی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک جرم کا ارتکاب کرتا ہے خواہ اس کا کوئی معاوضہ نہ ملے اور اس نے یہ جرم مجبوری کے تحت کیا ہو۔ وہ بے ایمانی کی خاطر ایمان

کے بہترین عناصر کو قربان کر دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگ بدترین ہوتے ہیں۔ وہ ظالم کے قدموں میں خودکشی کا ارتکاب کرتے ہیں۔

تیسرا گروہ ان صحابہ پر مشتمل تھا جنھوں نے جان بوجھ کر میدانِ جنگ کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ان لوگوں نے بدر، اُحُد اور حُنین کی لڑائیوں میں حصّہ لیا تھا اور جہاد اور ہجرتِ مدینہ کے وقت رسولِ اکرمؐ کے ساتھ ساتھ رہے تھے لیکن انہوں نے معاویہ کے قصرِ خضرا میں یہ تمام اعزازات اس کے ہاتھ بیچ دیے۔ انہوں نے حدیث اور سُنّت پر مبنی روایات ایک دینار فی روایت کی شرح سے فروخت کیں اور ان کے دام وصول کیے۔ ان لوگوں میں ابوُدرداء، ابوُہریرہ اور ابوُموسیٰ شامل تھے۔ ابوہریرہ کو (جسے حدیث بیان کرنے کا ماہر سمجھا جاتا تھا) اموی دربار میں اتنی اہمیّت حاصل ہو گئی تھی کہ معاویہ کے بیٹے اور جانشین یزید نے عبداللہ ابن سلام کی بیوی اوریناب سے راہ و رسم پیدا کرنے کی خاطر اسے مقرر کیا تھا۔

اب آپ غور کریں کہ نوجوان اس صورتِ حال کو دیکھ کر کیا سوچتے ہوں گے۔

امام حسین علیہ السلام کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کا یہی موقع تھا۔ یہ انقلاب کے بعد دوسری نسل تھی۔ یہ وہ نسل تھی جسے حضرت رسولِ اکرمؐ کے شاندار دور، گرانمایہ فتوحات اور صحابہ کے جوش اور محبت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ صحابۂ رسولؐ سے اس قسم کی باتیں سن کر ان کا محبت کا جذبہ سرد پڑ جاتا تھا کیونکہ ان کی تمام اُمیّدوں، ایمان اور خیالات کا اِنحصار صحابہ پر تھا جو انقلاب کے تربیت یافتہ تھے۔

جب نوجوان ہر روز اپنے ایک ہیرو کا زوال دیکھتے ہوں گے تو انہیں کتنی مایوسی ہوتی ہوگی اور اسلام پر ان کے ایمان میں کتنی کمی واقع ہو جاتی ہوگی۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ کیا کل کی نسل، رسولِ اکرمؐ اور انقلاب کے دور کی نسل یعنی

صحابہ کی قسمت میں یہی لکھا تھا؟

تاہم دوسری نسل جو تجربہ کار ہونے یا نہ ہونے سے قطع نظر سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ نئی جاہلیت سے مقابلے کے لیے تیار ہوئی وہ جو کچھ ہو رہا تھا اس سے باخبر تھی۔ انقلاب کی اس دوسری نسل کے مظہر اور رہنما حُجر بن عدی تھے۔ حُجر رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں نوعمر تھے۔ وہ امام علیؑ کے دور میں جوانی کی عمر کو پہنچے اور امام حسنؑ کے زمانے میں میدانِ عمل میں داخل ہوئے۔ وہ مُدبّرانہ صفات کے مالک اور ایک ذمہ دار اور باخبر مجاہد تھے۔ وہ امام حسنؑ کے معاویہ سے صلح کرنے کے شدید ترین مخالفوں میں سے تھے حتیٰ کہ جب امام حسنؑ نے صلح کے عہد نامے پر دستخط کیے تو حجر نے انہیں مخاطب کر کے کہا:

"آپ نے صلح پر رضامند ہو کر لوگوں کو ذلیل کیا ہے"۔

حجر ایک جوشیلے اور آتش مزاج انقلابی تھے لیکن ایک دن امام حسنؑ نے ان سے تخلیے میں بات کی اور انہیں اپنے طرزِ عمل کی صحّت کے بارے میں قائل کر دیا بلکہ مستقبل میں جدّوجہد کی کامیابی کے متعلق بھی امید بندھائی۔

تاریخ میں اس گفتگو کی تفصیلات کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بس اتنا پتا چلتا ہے کہ حجر مطمئن ہو کر واپس آئے۔ حجر کوئی زود باور انسان نہیں تھے اور نہ ہی وہ ایسے شخص تھے جو مصالحت پر مبنی معقول تصفیے پر راضی ہو جاتے یا تقیّے، تحمل اور بے خطر جدّوجہد کا فلسفہ قبول کر لیتے۔ وہ اس بات کے قائل بھی نہیں تھے کہ محض پیشوا کے احترام کے طور پر امام حسن علیہ السلام کی رائے کو بلا چون وچرا قبول کر لیتے۔

مشہور مصری مصنّف طٰہٰ حسُین نے حُجر اور امام حسنؑ کی ملاقات اور

اسی طرح کی ایک اور ملاقات کا ذکر کیا ہے جو امام علیہ السلام اور سُلیمان ابن صرد خُزاعی کے مابین ہوئی۔ جیسا کہ طٰہٰ حسین نے لکھا ہے سُلیمان بھی پرامن تصفیے پر بے حد مُعترض تھے۔ موصوف مصنف کا کہنا ہے کہ امام حسنؑ نے اس قسم کی دلیل دی ہو گی کہ میدان جنگ میں کھلم کھلا لڑائی لڑنے کا نتیجہ اس کے علاوہ کچھ نہ نکلے گا کہ جو قوّت باقی رہ گئی ہے اسے بھی تباہ کر دیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہو گا کہ اس کی بجائے ایک خفیہ تنظیم قائم کی جائے جو اپنی جدّوجہد زیرِ زمین مؤثر طور پر جاری رکھ سکے۔

حکومتِ وقت کے خلاف مزاحمتی تحریک اور انقلابی کارروائیوں کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ یہی وہ تنظیم تھی جو بنی اُمیّہ اور بنی عبّاس کی خلافتوں کے دوران ائمّہ اہلبیت علیہم السّلام کے آخری امام کے زمانے تک پوری اسلامی مملکت میں پھیل چکی تھی اور جس نے شیعہ مزاحمتی تحریک کیلئے بنیاد کا کام دیا۔

حجر ابن عدی، علی ابن حاتم اور ان کے دوسرے ساتھی ایسے جوشیلے نوجوان تھے جن کے لیے روز افزوں مظالم، حکام کی مطلق العنانی، لوگوں کے حقوق کی پامالی اور احکامِ دین کی خلاف ورزیوں کا برداشت کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ اس بات پر مُصر تھے کہ لوگوں پر مسلّط اس گمراہ حکومت کا مقابلہ کیا جائے جو حق و صداقت، عدل و انصاف اور احکامِ اسلام کو پامال کر کے دن بدن قوی ہوتی جا رہی تھی۔

حُجر کی قیادت میں حق پرستوں کی جدّوجہد زور پکڑتی گئی حتیٰ کہ بنی اُمیّہ نے انتہائی بدنیتی پر مبنی ایک منصوبے کے تحت ایک فرمان جاری کیا جس کے مطابق حُجر کو ملحد قرار دیا گیا۔ (مقامِ حیرت ہے کہ یہ فرمان بنی اُمیّہ کے بدقماش لوگوں نے جاری کیا!)

اس کے بعد امام علیؑ کے مکتب کے تربیت یافتہ اور تحریک میں حصّہ لینے والی دوسری نسل کے ان شیر دل نوجوانوں کو گرفتار کر لیا گیا اور دمشق کی حکومت کی مخالفت کرنے کے جرم میں شہید کر دیا گیا۔

ع بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اب امام حسین علیہ السّلام کی باری آئی۔ تاہم اس وقت تک انقلاب کی بنیاد اور قوّت برباد ہو چکی تھی اور حکومتِ وقت کی مزاحمت کرنے والے یا تو قتل کر دیے گئے تھے یا انہیں خاموش کیا جا چکا تھا۔ جن باایمان صحابہ نے اپنے ایمان کا سودا نہیں کیا انہوں نے بھی حق و صداقت کی خاطر جنگ لڑنے، سماجی اور سیاسی جدّوجہد سے پیدا ہونے والے خطرات کا مقابلہ کرنے اور لوگوں کو ظلم و ستم سے آزاد کرانے کی بجائے گوشہ نشین ہو کر زہد و ریاضت میں مصروف رہنے میں عافیت سمجھی اور شرافت، پارسائی اور خاموشی کے خول میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ علاوہ ازیں رسولِ اکرمؐ کے بہت سے ایسے ممتاز صحابی بھی تھے جو معاویہ کے قصرِ خضرا میں رہ کر بیت المال سے استفادہ کر رہے تھے جبکہ دوسری نسل کے جانباز بنی اُمیّہ کے خلاف جدّوجہد کرتے ہوئے شکست کھا چکے تھے۔

مطلق العنان فرمانروا نے تلوار اور دولت کے بل بُوتے پر یا عہدوں کا لالچ دے کر یا عیارانہ ہتھکنڈوں سے سب کی زبانیں بند کر دیں۔ خوف، دولت اور فریب کے دباؤ اور بدمعاملگی اور بداخلاقی کی عام آزادی اور خیالات، معتقدات اور احساسِ ذمّہ داری پر قدغن لگانے کے ساتھ ساتھ ابلہ فریبی کے طریقِ کار کو حرکت میں لایا گیا یا یوں سمجھیے کہ ظلم و ستم کی کھلی چھٹی دے دی گئی اور فکر و عمل کی آزادی کو دبا دیا گیا۔ برسرِ اقتدار ٹولے نے معاشرے کے اخلاق بگاڑ کر رکھ دیے۔ انہوں نے حقیقی اصولوں، ایمان کی صداقت، انقلاب، تحریک کی بنیاد اور اسلام پر

تابڑ توڑ حملے کر کے انہیں مٹانے کی کوشش کی اور عیّارانہ طریقے سے تسلیم و رضا کی تلقین کر کے لوگوں کے دل و دماغ کو مفلوج کر دیا۔

جدید جاہلیت کے علمبردار ٹولے کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ خاندانِ نبوّت کو تباہ کرنے یا علیؑ کو قتل کرنے یا حسنؑ کی فوج کو شکست دینے یا خفیہ اور بزدلانہ طور پر خود حسنؑ کا کام تمام کرنے سے انقلاب کا خطرہ نہیں ٹلے گا۔

انہیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ حق و صداقت، اسلام کی روح کے عمیق ادراک، دعوتِ حق کے صحیح علم اور رسولِ اکرمؐ کی بعثت کے حقیقی معانی کو وحشیانہ قوّت، جارحیّت اور عیّاری کے ذریعے اور انصاف کو پامال کر کے دبانا ممکن نہیں جبکہ اموی حکومت کا دارومدار انہیں ناپسندیدہ صفات پر تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عبداللہ ابن مسعود جیسی دلاور شخصیّتوں کو (جنہیں ناانصافی کے خلاف احتجاج کرنے پر اذیتیں دی گئیں) قتل کرنا، انصاف کی خاطر لڑنے کے لیے بنائی گئی ہر مورچہ بندی کو مسمار کرنا، حاکمِ وقت کے قائم کردہ نظام کے خلاف مقاومت کرنے والی ہر امکانی قوّت کو معدوم کرنا تحریک کے حقیقی رہنماؤں کو شہید کرنا اور کشمکش کے قابلِ قدر شرکاء کو راستے سے ہٹانا بھی بے سود ہے۔ انہوں نے بڑی اہم اور ذہین شخصیّتوں کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ مخالفین کی ہر جدّوجہد کو کچل دیا۔ تمام محاذوں پر کامیابی حاصل کی اور تمام اسلامی ممالک پر جو شام سے خراساں تک پھیلے ہوئے تھے بنی امیہ کی بادشاہت کا مکمل تسلّط قائم کر دیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود انہیں مزاحمت کو کچلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

انہوں نے اپنی سلطنت کو مستحکم کرنے اور آزادی سے حکومت کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ فتوحات حاصل کر کے اپنا تسلّط جمایا۔ پیشوائی کے دعویدار بنے۔ لوگوں کے محاذِ آزادی کو تباہ کیا۔ دین کا دفاع کرنے والوں، آزادی کے

متوالوں اور حقوق کے طالبوں کو منتشر اور برباد کیا۔ عدالت کو بے دست و پا کیا اور بالآخر اسلام کے اسلحہ، سواریوں اور سامانِ جنگ پر قبضہ جمایا — لیکن ان کی یہ تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔

بنی اُمیّہ کے ذہین اور باہوش سیاستدان اپنے آپ کو بخوبی سمجھتے تھے۔ وہ عوام کو اور وقت کے تقاضوں کو بھی جانتے تھے۔ یہ معاشرہ اسلام کے عظیم فکری، سماجی، سیاسی اور روحانی انقلاب کے ظہور سے فقط ایک نسل دور تھا۔ ایک نقطۂ نگاہ سے یہ ٹولہ جہالت اور شرک سے اور بدر، اُحُد اور خندق کی لڑائیوں سے جو الحاد، بت پرستی، بردہ فروشی اور سرمایہ داری کے علمبرداروں نے رسولِ اکرمؐ کے خلاف لڑیں فقط ایک نسل کا دور تھا۔

بنی اُمیّہ جانتے تھے کہ شکست کی سیاہ راکھ کے نیچے خطرناک لاوا موجود ہے۔ انہیں علم تھا کہ گو فوج شکست کھا چکی ہے لیکن اسلام اپنی پوری قوت کے ساتھ زندہ ہے اور گو اہلِ ایمان کی جماعت منتشر ہو چکی ہے لیکن ایمان اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ عدل کے علمبردار اور حق و صداقت، آزادی اور انسانیت کے حامی اور پشت پناہ تھے وہ سب ختم ہو چکے تھے۔ آزادی کا مورچہ گرایا جا چکا تھا اور مزاحمت کا قلعہ تباہ ہو چکا تھا۔ تاہم عدل کی بنیاد، حق کی پرستش، آزادی کا ذائقہ اور انسانیت سے محبت ابھی باقی تھی۔ علیؑ حالتِ نماز میں شہید ہو چکے تھے لیکن ان کا پیدا کیا ہوا جذبہ ابھی تک زندہ تھا۔ ابوذر جلاوطن ہونے کے بعد ربذہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکے تھے لیکن ان کا نعرۂ مستانہ ابھی تک فضا میں گونج رہا تھا۔ حجر کو شام میں تہہ تیغ کیا جا چکا تھا لیکن ان کی روشن کی ہوئی آگ ابھی تک بھڑک رہی تھی۔

ان خطرات کا مرکز اور بغاوتوں کا منبع مدینہ میں نہیں تھا جہاں لوگوں

کا قتل عام کیا گیا تھا نہ ہی کعبہ میں تھا جہاں لوگوں پر پتھر برسائے گئے تھے نہ ہی یہ کوفہ میں تھا جس پر شاطرانہ چالوں سے قبضہ کر لیا گیا تھا نہ ہی مسجد نبوی میں تھا جہاں گھڑسواروں نے لوگوں کو گھوڑوں کے سموں تلے روند کر انکے سر بدنوں سے جدا کر دیے تھے۔ نہ ہی یہ رسولِ اکرمؐ کے گھر میں تھا جو اب ویران پڑا تھا اور نہ ہی حضرت فاطمہؑ کے گھر میں تھا جسے راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا۔ یہ قرآن بھی نہ تھا جسے تیروں سے چھلنی کر دیا گیا تھا۔ تو پھر آگ کا یہ مرکز اور خطرات کا دائمی منبع آخر کہاں تھا؟

یہ مرکز اور منبع دلوں اور دماغوں میں تھا! اگر ان دوسرے چشموں کو تباہ نہ کیا جاتا تو تمام فتوحات اور تمام قوتیں معرضِ خطر میں رہتیں۔ اگر یہ دوسرے چشمے جاری رہتے تو ابوذرؓ، حجرؓ، عمارؓ اور مالکؓ جیسے جانباز بھی شہادت پاکر زندہ رہتے اور نئے دلاوروں کو میدانِ جنگ میں بھیجتے رہتے۔ اگر علی علیہ السلام کے مکتب کا جذبہ فنا نہ کیا جاتا تو قتل عام کرنے والے جلادوں کو اپنی جانوں کے بارے میں ہرگز اطمینان نصیب نہ ہوتا اور وہ اپنے آپ کو ایک لحظہ کے لیے بھی محفوظ محسوس نہ کرتے۔

آسمانی انقلاب کا مشن قرآن مجید میں نہیں بلکہ انہیں دلوں اور دماغوں میں ہے۔ گو امام علیؑ مسجد کوفہ میں شہید کر دیے گئے لیکن وہ پھر بھی زندہ رہے۔ تمام لوگ جو شہید کیے گئے، تمام جگہیں جو فتح کی گئیں، تمام محاذ جن پر شکست ہوئی اور تمام سامان جنگ اور قلعے جن پر قبضہ کیا گیا ان سب کا تعلق سچائی، آزادی اور عدل سے تھا اور سچائی، آزادی اور عدل کا بول بالا کرنے کے لیے جدّوجہد جاری رہی۔ لہٰذا یہ ضروری سمجھا گیا کہ ان دونوں محاذوں کو تباہ کر دیا جائے۔

حملے شروع ہو گئے۔ خطرے کے دو حقیقی منابع یعنی دلوں اور دماغوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے اسلحہ جمع کیا گیا۔ تاہم اس قسم کی جنگ کے لیے مختلف

قسم کی تلواروں، سپروں، کمانوں اور تیروں اور مختلف قسم کی فوج، حکمتِ عملی، منصوبہ بندی، حکّام اور فاتحین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس فوج کو آگے بڑھانے اور حملہ کرنے کے لیے مال و دولت، رے اور عراق کی حکومت کے وعدے، عَمرو بن عاص کی عیّاری اور بُسر ابنِ ارطات، یزید ابن مَہلب اور حجاج ابنِ یوسف کی سفّاکی اور غارت گری غیر موثر ہوتی ہیں۔

اس ناگہانی حملے میں قرآن اسلحہ اور سنت سپر ہوتی ہے۔ غور و فکر اور علم سامان جنگ ہوتے ہیں۔ ایمان قلعہ بندی ہوتا ہے اور اسلام علَم ہوتا ہے۔ اس حملے کے لیے فوج دنیا پرست مفسروں، محدثوں، خطیبوں، عالموں، قاضیوں اور لیڈروں پر مشتمل ہوتی ہے۔

اس فوج کے سردار رسول اکرمؐ کے مقتدر صحابہ، نامور علماء اور بڑے بڑے مفتی تھے۔ حملہ شروع ہو گیا۔ مذہبی فوج نے بڑی آسانی اور کامیابی کے ساتھ اس سرزمین پر پیش قدمی کی جس پر دنیاوی فوج پہلے ہی آگے بڑھ کر رکاوٹوں اور مزاحمتوں کو ختم کر چکی تھی۔ یہ فوج اس سرزمین میں داخل ہوئی اور اس نے آگ کے دو اہم مراکز کو بتدریج فتح کر لیا۔ کوئی قابل توجہ مزاحمت نہیں ہوئی اور اس فوج نے ان مراکز کو ایک ہلاکت خیز محلول کے ذریعے اندر سے تباہ کر دیا۔ انہوں نے ایک ایسا مرکّب استعمال کیا جسے تیار کرنے کے طریقے سے تمام مذاہب کے پیشہ ور عالموں کا طبقہ بخوبی واقف ہے اور طولِ تاریخ میں وہ یہ نسخہ ایک دوسرے کو منتقل کرتے رہے ہیں۔ یہ وہی نسخہ ہے جس کے ذریعے یہودی فرعون سے زیادہ خونخوار، قارون سے بڑھ کر دولت کے پجاری اور بلعم سے بڑھ کر عیّار بن گئے اور جس نے عیسائیوں کو شیطانی اعمال کا علمبردار اور مذہب سے نفرت کرنے والا قیصر بنا دیا۔

ذی فہم لوگ بِک گئے اور علماء نے طاقتور لوگوں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ جب اسلام میں یہ صورت پیدا ہوئی تو اس نے ہر چیز کی قسمت بدل کر رکھ دی۔ تمام قدریں تباہ ہو گئیں۔ انہوں نے روح کو قتل کر دیا۔ اسلامی انقلاب کا رُخ موڑ دیا اور بالآخر لوگوں کو مذہب کے نام پر قربان کر دیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے علماء کی مدد سے حکومت کے اصولوں اور اعمال کی توثیق کی۔ مذہبی پیشواؤں نے "جبر" کا عقیدہ اپنایا تاکہ ہر چیز کو خدا سے منسوب کر دیا جائے۔ دو خوفناک ناسور لوگوں پر آن گرے یعنی "خدا کے نام میں" اور "خدا کا دین"۔

پہلا ناسور مذہبی پیشوا تھے۔ یہ برائے نام مذہبی اسکالر اور علماء تھے۔ یہ اسلام کے خطیب، دینی اسکالر اور قوم کے رہنما تھے۔ ان کا کوئی سرکاری عہدہ یا مقام نہیں تھا۔ یہ قانون نہیں تھے۔ یہ مکتبوں کے گوشوں میں پڑھتے اور پڑھاتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ کوئی شخص خواہ گنہگار ہو یا نیکوکار اور خواہ اس نے کوئی برا کام کیا ہو، دھوکا دیا ہو، شورش برپا کی ہو یا کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو اسے بہرحال خدا کے رحم اور مغفرت کی امید رکھنی چاہیے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے:

"ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا سے مغفرت کی امیدیں وابستہ کیے ہوتے ہیں"

(سورۂ توبہ - آیت ۱۰۶)

امید رکھنے سے ہی خدا کی مغفرت اور رحم کا نزول ہوتا ہے۔ خدا معاف کرنے والا ہے اور امید ہے کہ وہ ہر گناہ معاف کر دے گا۔ لہٰذا ایک عام آدمی کو جو خود بھی گنہگار ہو ایسے مجرموں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت ہے۔ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ انہیں بُرا بھلا کہے یا ان سے لڑے۔

اس کے برعکس جب آپ مجرم کو ظالم اور سازشی کہتے ہیں اور اسے

لعنت ملامت کرتے ہیں اور دوسرے کو مظلوم اور غلام کہتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ آپ خدا ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں کیونکہ خدا ہی سب سے بڑا حاکم ہے اور اسی بنا پر وہ سب کے اعمال کا حساب کتاب کرتا ہے اور جو شخص غیر عادلانہ رویّہ اختیار کرے اس کے بارے میں فیصلہ دیتا ہے۔ پس ایک ظالم اور سازشی شخص کے بارے میں فیصلہ دینے کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔

آپ یہاں میزانِ عدل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ خدا ہیں؟ کیا اس سے پیشتر کہ خدا اپنے بندوں کا حساب کتاب کرے آپ انہیں ملزم ٹھہرا کر ان کا حساب کتاب کرنا چاہتے ہیں؟

نہیں۔ ایک سازشی شخص اور ایک خادمِ خلق کے مابین فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمیں ایک مجرم کو سزا دینے کی اجازت نہیں۔ ہمیں اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ کسی مخصوص گروہ کی مخالفت کریں۔ ہمیں ان سب کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے اور جزا و سزا کا معاملہ خدا پر چھوڑ دینا چاہیے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو مذہبی پیشواؤں کی جانب سے پیدا ہوتا ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ "ہر چیز خدا کے سپرد کر دو"۔

امید کے اس مرض یا مذہبی پیشواؤں کے پیدا کردہ ناسور نے اسلام کی دوسری نسل کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ یہ وہ نسل تھی جسے اسلام کے مکتب میں کافی تربیت نہیں ملی تھی اور جس نے قرآن اور اسلام کے مفاہیم کی تعلیم رسولِ اکرمؐ، امیر المومنینؑ اور مہاجرین اور انصار سے حاصل نہیں کی تھی۔ پس وہ لوگ اسلام کی تعلیمات بالواسطہ طور پر ان اشخاص سے حاصل کرنے پر مجبور تھے جنہوں نے اپنے افکار و عقائد بیچ دیے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی معلومات، ان کے اخذ کردہ نتائج اور ان کا دینی جذبہ ہمیشہ ان مذہبی پیشواؤں کے پراپیگنڈے سے مسموم رہے

جنہیں برسرِ اقتدار گروہ کی حمایت حاصل تھی چنانچہ ایک طرف تو ذمہ دار اور با اصول مسلمان تھے جو 'امر بالمعروف و نہی عن المنکر' پر ایمان رکھتے ہوئے اس پر عمل پیرا تھے اور دوسری جانب وہ لوگ تھے جو شیطان سے دوستی گانٹھے ہوئے تھے۔ یہ دو جماعتیں ایسی تھیں جو ایک دوسری کے پہلو بہ پہلو موجود تھیں لیکن ان کا ایک دوسری سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

دوسرا نا سور جس نے اس دور میں پرورش پائی وہ قضا و قدر کا عقیدہ تھا۔ بنی امیہ کے دور میں جو پہلا دینی مکتب وجود میں آیا وہ مذہبی پیشواؤں کا مکتب تھا۔ انہوں نے قرآن کو جہاد سمیت تمام افکار و عقائد کو مفلوج اور تباہ کرنے کے لیے استعمال کیا۔ دوسرا مکتب "فلسفۂ قضا و قدر" کا تھا اور یہ پہلا فلسفیانہ مکتب تھا جو بنی اُمیّہ کے زمانے میں الٰہی فلسفے کے روپ میں ظاہر ہوا۔

اب ہم دیکھیں گے کہ بظاہر پارسا چہروں کے پیچھے کیا کیا خباثتیں چھپی ہوئی ہیں۔ قرآن مجید کے مطابق تقدیرِ الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ "خدا قادرِ مطلق ہے"۔ ان لوگوں نے اس کی تعبیر یہ کی کہ کائنات میں جو مصیبت بھی رونما ہو وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ انسان کی جو حالت اور جو حیثیت بھی ہو، وہ جو انتخاب بھی کرے اور جو عمل بھی بجالائے، خواہ وہ بداطوار ہو یا نیکوکار ہو، قاتل ہو یا مقتول ہو یہ سب چیزیں اللہ کی مشیت اور ارادے کا پرتو ہیں۔ خواہ کوئی غلام ہو یا آقا، محکوم ہو یا حاکم سبھی کا تعلق اللہ سے ہے۔ اللہ ہی قوّت دیتا ہے اور وہی اسے لے لیتا ہے، وہی مارتا ہے اور وہی پیدا کرتا ہے، وہی عزت دیتا ہے اور وہی ذلت دیتا ہے۔ کسی دوسرے کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔

نصِّ قرآنی اور احادیثِ رسولؐ کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ایماندار مسلمان قضا و قدر کی اس تعبیر کی صحت اور دلکشی سے بے حد متاثر ہوئے۔ جو حدیثیں

اس نظریے کے جواز میں پیش کی گئیں وہ وہی تھیں جو ابو بریرہ جیسے لوگوں نے راتوں رات اختراع کیں اور رسولِ اکرمؐ سے منسوب کر دیں حتیٰ کہ ان کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو باتیں آنحضرتؐ سے منسوب کی گئیں انہیں کہنے کے لیے انہیں کم از کم ایک ہزار سال کی زندگی درکار تھی۔

خدا کی رضا کے مطابق زندگی گزارنے کے خواہشمند مسلمانوں کے خیالات پر ان علماء نما لوگوں کی تبلیغات کا بڑا مضر اثر مرتب ہوا۔ ان کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی کہ بنی امیہ کو اس لیے حکومت نصیب ہوئی کہ خدا نے انہیں یہ قدرت بخشی اور اگر امام علیؑ کو ناکامی ہوئی تو اسکی وجہ یہ تھی کہ خود خدا انہیں ناکام رکھنا چاہتا تھا۔

خواہ کوئی شخص اچھا ہو یا برا اگر اچھے لوگوں کا خاتمہ ہو جائے اور برے لوگ برسرِ اقتدار آجائیں تو یہ سب کچھ ایک بلند تر حکمت کے تحت ہوتا ہے اور گو ہم اس حکمت کو نہ سمجھ پائیں لیکن اس کا دار و مدار رضائے الٰہی پر ہوتا ہے اور ہمارا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ لہٰذا جو شخص برسرِ اقتدار ہو اس کے ساتھ درشتی سے پیش آنا، اس کے خلاف کوئی اقدام کرنا یا اسے اس کے مقام سے ہٹانے کی کوشش کرنا خدا کی مشیت، قدرت اور ارادے پر تنقید کرنے اور اس کے خلاف احتجاج کرنے کے مترادف ہے۔

رسولِ اکرمؐ کی ہجرت کو ساٹھ سال گزر چکے تھے۔ آپ کے لائے ہوئے انقلاب سے جو کچھ حاصل ہوا تھا وہ تباہ و برباد ہو چکا تھا اور نصف صدی پیشتر جو کامیابیاں نصیب ہوئی تھیں ان پر پانی پھر چکا تھا۔ آنحضرتؐ کی لائی ہوئی کتاب بنی اُمیّہ کے نیزوں پر آویزاں تھی۔ جس تہذیب اور جن افکار کو اسلام نے جہاد اور مسلسل کوششوں سے لوگوں کے ذہنوں میں پروان چڑھایا تھا وہ بنی امیہ کی حکومت کے جواز کا ذریعہ بن گئے تھے۔

تمام مسجدیں شرک، ظلم اور مکر و فریب کی تبلیغ کے مراکز بن گئی تھیں۔ جو تلواریں کبھی مجاہدین کے ہاتھوں میں ہوا کرتی تھیں اب جلادوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ زکات اور دوسرے اسلامی ٹیکسوں سے جو آمدنی ہوتی تھی اب وہ معاویہ کے قصرِ خضرا کی دیکھ بھال پر خرچ کی جاتی تھی۔

حق و صداقت، توحید، نبوّت، سنّت، کتاب اور وحی کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا اب اس کے نگران معاویہ اور اس کے ساتھی تھے۔ امت کے خیر خواہ، مخلص رہنما، قاضی، مفسر، قاری، علماء اور مسجدوں کے خطیب یا تو قتل کیے جا چکے تھے یا مسجدوں کے گوشوں میں ذکر اور تسبیح میں مشغول رہتے تھے اور یا پھر شامی ٹولے یعنی بنی امیّہ کے مبلغ اور موید بن گئے تھے۔

جس دین کی بنیاد حضرت محمد مصطفےٰ ؐ نے رکھی تھی اس کی تبلیغ کے لیے کوئی محراب یا منبر باقی نہیں بچا تھا۔ اس وسیع مملکت میں جس میں روم، ایران اور عرب جیسے طویل و عریض علاقے شامل تھے خانوادۂ رسول ؐ کا کوئی غمخوار یا ہمدرد باقی نہیں رہا تھا۔ جس نسل نے خلوصِ دل سے اسلامی انقلاب کی خدمت کی تھی اب وہ معدوم ہو چکی تھی۔ مہاجرین اور صحابۂ رسول ؐ کی کاوشوں کا حاصل برباد ہو چکا تھا۔ معاویہ کے قصرِ شاہی کا خزانہ سیم و زر سے معمور تھا اور اسے حاصل کرنے کے لیے اسے کوئی مشقت نہیں اٹھانی پڑی تھی۔

گزشتہ دور کے انقلابی مجاہدین کو یا تو ربذہ کے سنگلاخ ویرانے میں بھوکوں مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا یا انہیں مرج العذرا کے میدان میں تہ تیغ کیا جا چکا تھا۔ انقلابی تحریک چلانے والی دوسری نسل کا قتلِ عام ہو چکا تھا۔ جو لوگ باقی بچ گئے تھے وہ یا تو قضا و قدر کے قنوطیت پر مبنی فلسفے پر غور و فکر میں مشغول تھے اور یا انہوں نے درباری علماء کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ انہیں یہ احساس ہو گیا

تھا کہ حالات کو بدلنے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے اور اپنے تجربے کی بنا پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کی حفاظت کرنے، دن بہ دن زور پکڑنے والی نئی جہالت کا مقابلہ کرنے اور حق و انصاف قائم کرنے کے تمام امکانات معدوم ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ہجرت کے بعد ساٹھ سال گزر جانے پر تمام طاقت جابر و فاجر حاکم کے قبضے میں تھی۔ اقدار کا تعین حکمران ٹولہ کرتا تھا اور افکار اور خیالات کی تشکیل اس مقصد کے لیے مقرر کردہ مبلغین کے پراپیگنڈے کے ذریعے ہوتی تھی۔ چنانچہ لوگوں کو خالی الذہن کر کے ان کے ذہنوں میں مذہب کے نام پر زہر بھر دیا گیا۔ عقائد کو بدلا گیا، خریدا گیا اور مفلوج کیا گیا اور اگر یہ سب کوششیں ناکام ہوئیں تو تلوار کے ساتھ صاحبِ ایمان کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اس موقع پر امام حسینؑ اس طاقت کے مقابلے پر آئے جو افکار، عقائد، قرآن، دولت، پراپیگنڈہ، سامانِ حرب اور ورثۂ رسولؐ کی مالک بنی بیٹھی تھی۔

امام حسینؑ خالی ہاتھ تھے۔ ان کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کریں۔ کیا وہ راہب بن جائیں اور ایک کونے میں بیٹھ کر تسبیح و تقدیسِ الٰہی میں مشغول رہیں؟ کیا وہ فقط یہ سوچ کر مطمئن ہو جائیں کہ چونکہ وہ رسولِ خداؐ کے نواسے اور علیؑ و فاطمہؑ کے فرزند ہیں اس لیے ان کے لیے جنت کا حصول یقینی ہے؟

نہیں۔ وہ ہرگز ایسا نہیں سوچ سکتے تھے۔ دوسرے مومنین کا اس انداز میں سوچنا خواہ جائز بھی ہوتا لیکن خود ان کی ذمہ داری بڑی سنگین تھی۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی جانتے تھے کہ :

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

کیا وہ جہاد کی ذمہ داری سے پہلوتہی کر کے اللہ کا قرب حاصل کرنے کی خاطر محض تسبیح و تمجید پر اکتفا کر سکتے تھے ؟ نہیں - ہرگز نہیں !

امام حسینؑ کے لیے ایک راستہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں کہ ہم بنی امیہ کے خلاف سیاسی جنگ کا آغاز نہیں کر سکتے کیونکہ اس قسم کی جنگ کے لیے عسکری قوّت اور عسکری ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمارے پاس نہیں - لہٰذا ہم ان کے خلاف ذہنی جہاد کریں گے لیکن امام علیہ السلام کے لیے مسئلے کا یہ حل بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعد میں امام صادق علیہ السلام نے اپنے دورِ امامت (۷۴۲ تا ۷۵۲ء) میں ایک ذہنی مکتب قائم کیا تو اس کی دو وجوہ ہیں۔

بنی امیہ کی حکومت کے آخری اور بنی عباس کی خلافت کے ابتدائی دور میں اگر ایک طرف یونانی فلسفہ مسلمانوں کے دماغوں میں نفوذ کر رہا تھا تو دوسری طرف وہ ہندوستان اور ایران کے صوفیانہ مکاتبِ فکر اور نصرانی خیالات کی جانب بے حد مائل ہو رہے تھے۔ اسی بنا پر عباسی دور کے مسلمان مفکرین نے سیاسیات کی جانب توجہ دی۔ وہ درست اور نادرست اور حق و باطل کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے۔ وہ یہ سوچنے لگے کہ علیؑ کیوں رخصت ہوئے اور معاویہ کیوں آیا۔ وہ اس بارے میں بھی غور کرنے لگے کہ امت پر کیسے حکومت کرنی چاہیے۔ سانحہ کے ساتھ انہیں "محبت کے سات شہروں" (جیسے کہ آجکل پیرس وغیرہ مشہور ہیں) سے بھی لگاؤ پیدا ہوا۔ انہیں یہ دریافت کرنے کی بھی فکر پیدا ہوئی کہ وہ کونسا حقیقی اور اصلی مواد تھا جس سے خدا نے کائنات کو پیدا کیا۔ قرآن مجید کے یہ فلسفیانہ مسائل یا چند مخصوص عرفانی نکات تھے جنہوں نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ تاہم اگر وہ ان سوالوں کے جواب دینے میں کامیاب

بھی ہو گئے تو ان جوابات کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

بتدریج ان کے مطالعات اور مباحث کا دائرہ روح، جسم، کون و فساد، جوہر، تعلیل، عشق، پہلے دور، آخری دور، وجد اور حال تک وسیع ہو گیا لیکن انہوں نے ذمہ داری، معاشرے کو جواب دہی، عدل، مساوات، رہبری وغیرہ کے مسائل کو قطعاً فراموش کر دیا۔

حکمران ٹولے نے اپنے مکاتبِ فکر تخلیق کر لیے اور انہیں اسکالر، استدلال اور افکار مہیا کیے تاکہ اسلام کے بنیادی اصول تبدیل کر دیے جائیں اور اربابِ اقتدار اپنی استعداد ثابت کر سکیں۔

ان حالات میں ذہنی جدوجہد ضروری تھی اور یہ جدوجہد امام صادقؑ جیسی شخصیت کے لیے جن کے سیاسی کشمکش میں حصّہ لینے کا کوئی امکان نہ تھا بالخصوص لازم ہو جاتی تھی۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ:

"اگر مجھے فقط سات مخلص جانباز مل جاتے تو میں انقلاب برپا کرتا۔"

لیکن امام حسینؑ کے زمانے میں حالات مختلف تھے۔ ہجرت کو ابھی ساٹھ سال ہی ہوئے تھے اور مسلمانوں میں یونانی فلسفے کے نفوذ کے کوئی آثار نہ تھے ابھی اسلام میں وہ علوم داخل نہیں ہوئے تھے جو اس کی حقیقت اور صداقت پر اثر انداز ہو سکیں۔ دینِ اسلام کے بنیادی اصول ابھی تک اپنی جگہ پر قائم تھے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی یاد باقی تھی۔

معاویہ نے امام حسینؑ کو دعوت دی کہ آپ مسجدِ دمشق میں درس دیں اور لوگوں کو دینیات، تفسیرِ قرآن، اسلامی تہذیب، تاریخ، سیرتِ رسولؐ اور دوسرے ایسے مسائل جنہیں آپ چاہیں روشناس کرائیں۔ اس نے اس سلسلے میں آپ کے لیے وظیفہ مقرر کرنے پر بھی آمادگی ظاہر کی لیکن ساتھ ہی

یہ شرط بھی لگائی کہ آپ سیاست میں حصّہ نہ لیں کیونکہ اس کے کہنے کے مطابق ایسی سرگرمیاں ایک امام کو زیب نہیں دیتی تھیں!

تاہم امام حسینؑ کو علم تھا کہ "کسی فعل کی معاشرے میں اسی نسبت سے قدر و قیمت ہوتی ہے جس نسبت سے وہ دشمن کو نقصان پہنچاتے"۔ اس صورت میں امام حسینؑ کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا انہیں قیام کرنا چاہیے تھا؟ کیا انہیں مسلح انقلاب برپا کرنا چاہیے تھا؟ لیکن مسلح انقلاب کے لیے لشکر اور فوجی ساز و سامان کی شکل میں قوّت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں آپ کے پاس نہیں تھیں۔

پچھلے دنوں ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے یہ بات نوٹ کی کہ ہمارے اہلِ علم حضرات نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے یہ واحد تصنیف ہے جو مصنف کے ذاتی مطالعے پر مبنی ہے۔ فاضل مصنف نے موافق اور مخالف آرا پر مبنی تمام مواد جمع کیا ہے اور اس کا تجزیہ اور تشریح کر کے اس پر تبصرہ کیا ہے۔ کسی رائے کو رد کرنے یا قبول کرنے سے اجتناب برت کر مصنف نے بڑی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس نے کثیر حوالہ جات سے استفادہ کرتے ہوئے متعلقہ موضوع کا وسیع مطالعہ کیا ہے تاکہ اپنی علمی تحقیق کے نتیجے میں ایک نیا علمی نظریہ پیش کر سکے۔

مذکورہ کتاب کی انہیں خوبیوں کی بنا پر میں مصنّف کا مدّاح ہوں۔ حالانکہ ان صاحب سے میں ذاتی طور پر متعارف نہیں ہوں۔ میں ان کی ایک ایسے عالم کی حیثیت سے تکریم کرتا ہوں جس نے واقعات کی ٹھوس تحقیق، تشریح اور تحلیل کی ہے اور ایک آزاد مفکر کی حیثیت سے ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ مثلاً فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ:

"امام حسینؑ نے حکومتِ وقت کے خلاف سیاسی اور عسکری
قیام کی خاطر مدینہ چھوڑا تاکہ اس کے ظالمانہ تسلّط کا خاتمہ کرکے
اپنے اور دوسرے لوگوں کے حقوق حاصل کریں۔"

گو یہ ایک مثالی نظریہ ہے لیکن میں اس سے متفق نہیں ہوں کیونکہ یہ حالات کے مخصوص حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس نظریے کو رد کرتے ہوئے ایک صاحب نے کہا ہے:

"امام حسینؑ ایک سیاسی شخصیّت نہیں تھے تاکہ وہ حکومتِ
وقت کے خلاف قیام کرتے۔"

ان کا یہ کہنا تعجب انگیز ہے۔ اگر ان کا قول قبول کر لیا جائے تو پھر رسولِ اکرمؐ اور امام علیؑ کس نصب العین کی خاطر لڑتے رہے اور امام حسینؑ کے جنگ کرنے کا کیا مقصد تھا؟ کیا یہ ایک سیاسی مسئلہ نہیں تھا؟ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ مجرم لوگ عوام پر حکومت کر رہے تھے۔ بلا شبہ ایسے حالات میں ایک ذمّہ دار شخصیّت کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ظلم و ستم کا خاتمہ کرے اور حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر عوام کی دادرسی کرے۔ اس قسم کا اقدام ایک پیشوا کا حق ہی نہیں بلکہ اس کا فرض ہوتا ہے۔

لہٰذا امام کے لیے ضروری ہے کہ غاصِب حکومت کے خلاف سیاسی جنگ لڑے اور اس کا مسلح مقابلہ کرکے اس کی قوّت پاش پاش کر دے۔ حق و صداقت کا راج قائم کرے اور حکومت اپنے ہاتھ میں رکھے۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ عسکری اور سیاسی انقلاب امام حسینؑ کا حقیقی مشن تھا لیکن انہیں اس کے ذرائع میسّر نہیں تھے۔

جن لوگوں کا خیال ہے کہ امام حسینؑ نے سیاسی اور عسکری طور پر قیام کیا

وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ کوفہ ایک ایسا مرکز تھا جو امام حسینؑ، حضرت علیؑ اور خانوادۂ رسولؐ کا طرفدار تھا۔

ہم فرض کیے لیتے ہیں کہ کوفہ شہر اتنا طاقتور تھا کہ اگر امام حسینؑ وہاں پہنچ جاتے تو وہ اسے ایک مضبوط اسلامی قلعے میں تبدیل کر دیتے اور دمشق تک کو شکست دے کر اپنی زیر قیادت ایک آزاد اسلامی حکومت کی بنیاد رکھتے۔ تاہم ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ امام حسینؑ نے جو اقدام کیا اس کی نوعیت عسکری یا سیاسی نہیں تھی اور یہ ہم اس لیے نہیں کہتے کہ جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے سیاست کی جانب توجہ دینا اور ایک سیاسی انقلاب برپا کرنا امام حسینؑ کے لیے کوئی عیب کی بات تھی۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ تو امام کا فرض ہے۔ بلکہ جو ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انہیں اس قسم کا انقلاب برپا کرنے کے لیے امکانات میسر نہیں تھے۔

ممکن ہے آپ یہ اعتراض کریں کہ جب ہم خود یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کوفہ میں دمشق کو شکست دینے کی طاقت تھی اور وہ حکومت کی باگ ڈور امام حسینؑ کو سونپ سکتا تھا تو پھر اس بات پر یقین نہ کرنے کا کیا جواز ہے کہ بنی امیہ کے خلاف امام حسینؑ کے قیام کی نوعیت سیاسی اور عسکری تھی؟ اس نکتے کی وضاحت کے لیے ہمیں امام حسینؑ کی مدینہ سے روانگی اور اس سلسلے میں کیے گئے اہتمام پر نظر ڈالنی پڑے گی۔

امام حسینؑ مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے۔ مدینہ میں آپ کو اہلِ کوفہ کی جانب سے ایک دعوت نامہ موصول ہوا تھا جس کا مضمون یہ تھا:

"ہمیں آپ پر اعتماد ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ آپ ہمارا رہنما بننا قبول کر لیں گے۔ ہمیں آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے اور ہم آپ کو تقویت پہنچائیں گے۔ ہم غاصبوں اور ظالموں کے

خلاف آپ کا ساتھ دیں گے اور آپ کا دفاع کریں گے۔ ہمیں
اس استحصال پسند حکومت سے نجات دلائیے۔"

مدینہ سے رخصت ہوتے وقت امام حسینؑ نے اعلان فرمایا:

"اپنے اَبْ وجَدْ کی سنّت کی پیروی کرتے ہوئے میں امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کی خاطر مدینہ چھوڑ رہا ہوں۔"

پھر آپ اپنے اہلِ خاندان کے ہمراہ ۶۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے کھلے عام
مکّہ میں وارد ہوئے۔

مکّہ میں ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے جو حج کی ادائیگی کی خاطر وہاں جمع
ہوئے تھے آپ نے فرمایا:

"میں اپنی موت کی جانب جا رہا ہوں۔"

ظاہر ہے کہ جو شخص سیاسی انقلاب برپا کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہو وہ یہ
نہیں کہتا بلکہ اس کے الفاظ تو کچھ یوں ہونے چاہئیں:۔

"میں ایک گھمسان کی جنگ لڑنے جا رہا ہوں۔ میں فتح پاؤں گا۔
میں دشمن کا قلع قمع کر دوں گا۔"

لیکن امام حسینؑ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی بلکہ آپ نے فرمایا:

"بنی آدم کے لیے موت ایک ایسے خوبصورت گلوبند کی مانند
ہے جو ایک نوجوان عورت کے گلے میں پڑا ہو۔ موت بنی آدم کے
لیے ایک زیور ہے۔"

پھر آپ نے مکہ کو الوداع کہا اور اپنی موت کی جانب گامزن ہو گئے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک سیاست دان جو بنی اُمیّہ کے حیطۂ اقتدار میں رہ رہا
ہو اور اس کے اردگرد واقع سارے علاقے پر حکومتِ وقت کا پورا تسلّط ہو ایک

ایسے دور افتادہ علاقے کے لوگوں کے بلانے پر جنہوں نے مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کر رکھی ہو۔ ان کی انقلابی دعوت قبول کرلے اور پھر کھلم کھلا انہیں اطلاع دے کہ "میں آرہا ہوں"۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے بیوی، بچّوں، بھائیوں، بہنوں، بھتیجوں، بھانجوں غرضیکہ اپنے خاندان کے تمام مردوں اور عورتوں کو ساتھ لے کر رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ دن کی روشنی میں ایک قافلے کی شکل میں روانہ ہو جب کہ اسے ہر ایسے شہر سے گزرنا ہو جس پر حکومتِ وقت کا کنٹرول ہو اور اس کے کارندے اور سپاہی خواہ وہاں موجود ہوں؟

اِمام حسینؑ نے ۶۰۰ کلومیٹر کا فاصلہ اسی انداز میں طے کیا اور مکّہ میں داخل ہوئے۔ یہاں اموی حکومت کی رعایا، اس کے حُکّام اور مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے مسلمان جمع تھے۔ یہاں آپ نے ایک دفعہ پھر اعلان کیا کہ آپ کا ارادہ کوفہ جانے کا ہے۔ آپ نے اپنا سفر جزیرہ نمائے عرب کی مغربی سمت سے شروع کیا۔ جس انداز میں مدینہ سے مکہ میں آئے تھے اسی انداز میں مغرب سے مشرق تک کا تمام راستہ عبور کر کے عراق کی سرزمین میں داخل ہوئے اور کوفہ کے نزدیک پہنچے جو انقلاب کا مرکز تھا۔ ظاہر ہے کہ مرکزی حکومت اس نقل و حرکت کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

اگر ایک معروف سیاسی شخصیّت یا ایک عام سیاست دان جو برسرِ اقتدار حکومت کا مخالف ہو اپنا ملک چھوڑ کر ملک سے باہر مقیم انقلابیوں سے جا ملنا چاہتا ہو اور حکومت کے خلاف ان کی سرگرمیوں میں شرکت کا خواہشمند ہو تو ظاہر ہے کہ اسے ملک سے فرار ہونے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ بلاشبہ نہ تو اپنے ارادے کا اعلان کرنا چاہیے اور نہ ہی اسے یہ بتانا چاہیے کہ اسے انقلابیوں

کی طرف سے کوئی دعوت نامہ موصول ہوا ہے۔ اس کے برعکس اسے اپنا ارادہ ہر ایک سے پوشیدہ رکھنا چاہیے کیونکہ اگر وہ حاکمِ وقت سے یہ کہے کہ میں ایک انقلابی ہوں اور تمہاری حکومت کا مخالف ہوں۔ میں تمہاری اطاعت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں بلکہ ملک چھوڑ کر انقلابیوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں اور تمہارے خلاف لڑنا چاہتا ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے حکومت کی مخالف تحریک کی قیادت کرنے کو کہا ہے اور میں جلد از جلد یہ ذمّہ داری سنبھالنا چاہتا ہوں لہٰذا مجھے پاسپورٹ جاری کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوگا کہ اسے تختۂ دار پر لٹکا دیا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ امام حسینؑ نے کیا کیا۔

اِمام علیہ السلام نے باقاعدہ طور پر اور واضح الفاظ میں حکومتِ وقت، اس کے فوجی گورنر اور عوام کو بتا دیا کہ:

"میں بیعت کرنے کو تیار نہیں۔ میں مکّہ چھوڑ کر کوفہ جا رہا ہوں۔
میں موت کی جانب ہجرت کر رہا ہوں اور میں نے اپنے سفر
کی ابتداء کر دی ہے۔"

اگر امام حسینؑ خفیہ طور پر شہر چھوڑ دیتے اور لوگوں کو بعد میں اچانک پتا چلتا کہ آپ چلے گئے ہیں اور جس طرح رسولِ اکرمؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تھی اسی طرح آپ بھی بعض قبائل کی مدد سے خاموشی سے کوفہ پہنچ جاتے اور یہ بات کچھ مدّت بعد حکومت کے علم میں آتی کہ آپ کوفہ میں ہیں اور انقلابیوں کی قیادت کر رہے ہیں تو پھر یہ امر واضح ہو جاتا کہ آپ نے حکومتِ وقت کی مخالفت میں علَم بلند کر دیا ہے۔

لیکن امام حسینؑ کی نقل و حرکت کا انداز اور قافلے کی شکل میں روانگی ظاہر کرتی ہے کہ آپ کے اس سفر کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ آپ کا مقصد نہ تو فرار تھا

اور نہ ہی عزلت گزینی۔ آپ نہ حکومتِ وقت کی اطاعت قبول کر رہے تھے اور نہ ہی سیاست سے دستبردار ہو رہے تھے۔ تاہم آپ کا مطمحِ نظر ایک عسکری انقلاب نہیں تھا بلکہ آپ کا "اٹھنا" ذہنی، عِلمی، دینی اور اخلاقی معاملات کی درستی کے لیے تھا۔ پھر اس صورت میں آپ کو کیا کرنا چاہیے تھا؟

حالات نے ایسا رُخ اختیار کر لیا تھا کہ خیالات مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ بڑی بڑی شخصیتوں نے اپنے اصول بیچ ڈالے تھے۔ اہلِ ایمان بے یار و مددگار رہ گئے تھے اور فضائل خال خال نظر آتے تھے۔ نوجوان یا تو مایوس ہو چکے تھے اور یا بِک چکے تھے۔ اسلام کے علمبردار یا تو شہید ہو چکے تھے یا خاموش کر دیے گئے تھے اور یا انہیں بک جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب امت کی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ قلم ٹوٹ چکے تھے زبانیں کٹ چکی تھیں، حق و صداقت کے تمام ستون گرا دیے گئے تھے اور وہ باایمان پیروؤں کے سروں پر آ پڑے تھے۔

امام حسینؑ ایک ذمہ دار رہنما کی حیثیت سے دیکھ رہے تھے کہ اگر وہ خاموش بیٹھے رہے تو اسلام کو ایک سرکاری مذہب میں تبدیل کر دیا جائے گا اور وہ محض عسکری اور اقتصادی قوّت کا ملغوبا بن کر رہ جائے گا۔ اس کی کیفیت دوسری حکومتوں اور طاقتوں جیسی ہو جائے گی اور جب فوج اور حکومت کی قوّت کو زوال آئے گا تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ پھر اسلام کی حیثیت ایک گزرے ہوئے واقعہ کی ہو گی جو تاریخ کے اوراق کی زینت بن جائے گا۔

یہ صورتِ حال امام حسینؑ کے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی سی تھی۔ وہ نہ تو خاموش رہ سکتے تھے اور نہ ہی اس قابل تھے کہ جنگ کریں۔ وہ خاموش اس لیے نہیں رہ سکتے تھے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عمل کا صحیح موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ ہر چیز تباہ کی جا رہی تھی۔ لوگوں کے دلوں سے احساسات، افکار،

اعتقادات، مقاصد اور دین کے صحیح معنی محو کیے جا رہے تھے غرضیکہ جو دین حضرت محمدؐ لائے تھے اور جس کی ترویج اور استحکام کے لیے انہوں نے مسلسل جہاد کیا تھا اس کی بیخ کنی کی جا رہی تھی۔ باقی سب لوگ حکومتِ وقت کی متابعت کر رہے تھے۔ ان کے دل فریب خوردہ اور زبانیں گنگ تھیں لیکن امام علیہ السلام کے لیے خاموش رہنا ممکن نہیں تھا کیونکہ ان پر ظلم کے خلاف جدّوجہد کرنے کی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی۔

لیکن امام حسینؑ لڑ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے پاس کوئی لشکر نہ تھا۔ تمام پیشہ حکومتِ وقت کی قوت انہیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ وہ نہ تو آواز بلند کر سکتے تھے، نہ حکومت کی اطاعت قبول کر سکتے تھے اور نہ ہی اس پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ ان کے کندھوں پر ذمہ داری کا سنگین بوجھ تھا لیکن انکے ہاتھ خالی تھے۔ انکے نانا حضرت محمد رسول اللہؐ، والد علی مرتضیٰؑ اور بھائی حسن مجتبیٰؑ نے مسلسل کاوشوں اور جہاد کے ذریعے جو قوت مجتمع کی تھی اس میں سے انہیں ورثے میں عزت و آبرو، رنج و اندوہ اور عظیم ذمہ داری کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا تھا۔

امام حسینؑ تنہا بھی تھے اور غیر مسلح بھی جبکہ ان کے مقابلے پر دنیا کی ایک ظالم ترین سلطنت تھی جس نے دنیا کو فریب دینے کے لیے تقویٰ کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا لیکن تنہا ہونے کے باوجود وہ دینِ اسلام کے سامنے جوابدہ تھے۔ اس دین میں ایک تنہا شخص بھی اعلائے کلمۃُ الحق کے لیے ذمہ دار ہوتا ہے کیونکہ ذمّہ داری کی بنیاد قوت اور امکانات پر نہیں بلکہ علم و آگاہی پر ہے۔ جو شخص جس قدر زیادہ آگاہ ہوگا اتنی ہی اس کی ذمّہ داری عظیم اور سنگین ہوگی اور امام حسینؑ سے زیادہ آگاہ اور کون ہو سکتا تھا؟

آپ کی ذمّہ داری کیا تھی؟ آپ کی ذمّہ داری یہ تھی کہ حق و صداقت کی

معدومیت، عوام کے حقوق کے استحصال، تمام تر اقدار کی تباہی اور انقلاب کی یادوں کو زائل کرنے اور اس کے پیغام کو نیست و نابود کرنے کے خلاف جنگ کریں اور لوگوں کے محبوب دین اور تہذیب کی حفاظت کریں کیونکہ ان سب چیزوں کو ملیامیٹ کرنا عوام کے بدترین دشمنوں کا اوّلین مقصد تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر اسلام کے احکام اور تمام انسانی قدروں کو اپنے فسق و فجور اور لہو و لعب کی بھینٹ چڑھا کر ایک نئی اشرافیت، ایک جدید جہالت اور ایک نئے شرک کو رواج دینا چاہتے تھے۔

بنی نوع انسان کے خلاف کی گئی ان تمام فریب کاریوں اور جرائم کا سدِّباب کرنے اور عظیم آسمانی انقلاب کو تباہی سے بچانے کی ذمہ داری فقط ایک شخص کے کندھوں پر آپڑی تھی۔ حق و صداقت، عدل و انصاف اور علم و ایمان کا دفاع کرنے والا اور کوئی نہیں رہا تھا۔ اس یکہ و تنہا شخص کے علاوہ باقی سب یا تو قتل ہو چکے تھے اور یا بھاگ نکلے تھے۔ اب دین حق اور انسانیت کی حفاظت کا فریضہ فقط اسے انجام دینا تھا۔

امام حسینؑ نہ خاموش رہ سکتے تھے اور نہ ہی کوئی نعرہ بلند کر سکتے تھے۔ وہ خاموش نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ ان پر عائد شدہ عظیم ذمہ داری ان کے اقدام کی منتظر تھی اور نعرہ اس لیے نہیں بلند کر سکتے تھے کہ ان کی آواز کو خفیف کر دیا گیا تھا۔ ان کی آواز نہ تو فدا کار لوگوں تک پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی قصرِ خلافت تک اس کی رسائی ہو سکتی تھی جہاں جہاد، فتح، حج، قرآن اور اسلام کے نام پر ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کیا جا رہا تھا اور بیت المال پر تصرّف کر کے طرح طرح کی رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں اور رقص و سرود کی محفلیں گرم کی جا رہی تھیں۔

امام علیہ السلام کے لیے نبرد آزما ہونا لازمی تھا کیونکہ علم و آگہی کی

بنا پر جو فرض ان پر عائد ہوتا تھا وہ انہیں پکار رہا تھا۔ وہ انہیں اس لیے پکار رہا تھا کہ وہ 'حسینؑ' تھے اور اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ غیر مسلح، تنہا اور مجبور ہیں۔

اب امام حسینؑ کے لیے کیا چارۂ کار تھا۔ ان کی حسینیت انہیں جنگ پر ابھار رہی تھی۔ ان کے پاس جنگ کا کوئی ساز و سامان نہ تھا لیکن پھر بھی لڑنا ان کا فرض تھا۔ صورت حال کچھ ایسی تھی کہ آپ کے سبھی صلاح کار اپنی دانش اور تجربے کی بنا پر جنگ کے خلاف تھے لیکن امام حسینؑ نے اپنا فرض پہچانتے ہوئے لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ نے مدینہ چھوڑا اور مکہ تشریف لے آئے۔ یہاں آپ نے واضح الفاظ میں ان مسلمانوں کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا جو مناسکِ حج ادا کرنے کے لیے مختلف علاقوں سے وہاں آئے ہوئے تھے اور اس سوال کا جواب دینے کے لیے کہ یہ "کیونکر" ہوگا۔ آپ نے مکہ کو بھی خیرباد کہا۔

تاریخ کے اس نازک لمحے میں جبکہ عوام اور اسلام کا مقدر بدل رہا تھا اور اس کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ یہ سوال ہر ایک کے دل میں موجود تھا۔ اس لمحے سب کچھ درہم برہم ہو چکا تھا۔ وہ لوگ جو اسلام کے حق و صداقت، عدل اور آزادی سے مخلصانہ لگاؤ رکھتے تھے اور حالات کو دیکھتے ہوئے بے چین تھے اور اپنے آپ کو ذمہ دار محسوس کرتے ہوئے ایک انقلاب کے خواہاں تھے۔ اپنے دلوں میں سوچ رہے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ ہر ایک کے پاس اس سوال کا اپنا الگ جواب تھا۔

قضا و قدر کا عقیدہ رکھنے والوں کا کہنا تھا کہ ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا

چاہیے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ خدا کی حکمتِ بالغہ کے مطابق ہوتا رہے گا۔ خدا کی مرضی ہے کہ ایسا ہی ہو۔ انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے اس پر اسے مطمئن ہو جانا چاہیے اور اس کے لیے شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ آزادانہ طور پر اپنی تقدیر کا فیصلہ کرے۔

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ گو چند چیزیں موجود ہیں جیسے ظلم و ستم، جرم، حقوق کا غصب کرنا، جہاد کے دعوے، رسولِ اکرمؐ کی احادیث اور قرآن کی تبلیغ کرنے، زکات فنڈ میں اضافے اور مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لیے دوسرے علاقوں کی فتح وغیرہ لیکن یہ سب کی سب ذومعنی اور مغالطہ انگیز ہیں۔

تاہم کیا کیا جا سکتا ہے؟ خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتّا بھی درخت سے نہیں گرتا۔ خدا کی مرضی یہی ہے۔ اس کی حکمت کے مطابق کام اسی طرح انجام پاتے ہیں۔ کسی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ اس پر اعتراض یا تنقید کرے یا یہ تک کہے کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔

ہر ایک کو تقدیر کا لکھا ملتا ہے۔ اچھا یا بُرا جو واقعہ بھی ظہور پذیر ہوتا ہے وہ ازلی تقدیر کے مطابق ہوتا ہے جو قرآن مجید میں درج ہے۔ اگر علیؑ شکست کھاتے ہیں اور تنہا رہ جاتے ہیں اور معاویہ فتح پاتا ہے اور اسے قوت حاصل ہوتی ہے تو یہ سب کچھ خدا کی مرضی کے عین مطابق ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

"اللہ جسے چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلّت دیتا ہے۔"

"اللہ جسے چاہے قوّت عطا کرتا ہے۔"

پھر ہم کیا کہہ سکتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں ماسوا اس کے کہ خاموش

رہیں اور صبر کریں۔[1]

ظاہر ہے کہ اس فلسفے کے مطابق قابلیت، ناقابلیت یا جہاد کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ چونکہ سیدھے راستے کے انتخاب کا کوئی ذریعہ نہیں اس لیے ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ مذہبی پیشواؤں کا کہنا تھا کہ:

"ہم کیا کریں اور کس کے خلاف کریں؟ خدا اپنے سب بندوں کو حکم دیتا ہے کہ ناامید نہ ہوں اور نجات اور بہشت کی آرزو کریں۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم ایک شخص کو مجرم قرار دیں اور کہیں کہ وہ دوزخ میں جائے گا اور پھر اس کے خلاف جنگ کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے کہ آپ قیامت سے پہلے قیامت برپا کر دیں اور یوم حساب سے پہلے فیصلہ کریں اور سزا دیں۔"

---

[1] یہ محض اتفاقی امر نہیں کہ عُمر خیّام کو ہماری تہذیب میں از سرِ نو زندہ کیا جا رہا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس نے دنیا کے تمام لوگوں کو تسکین فراہم کی۔ یاد رہے کہ یہ قدردانی سائنس دان عمر خیام کی نہیں بلکہ شاعر عمر خیّام کی ہے۔ اس کی جانب توجہ ایک ایسے نابغۂ دہر کی حیثیت سے نہیں دی گئی جس نے ریاضی کے بعض پیچیدہ مسائل مُحیّر العُقول طریقوں سے حل کیے بلکہ اس حیثیت سے دی گئی ہے کہ اس نے کچھ اشعار لکھے۔ اگر مستشرقین اور اسلام اور ایران کے بارے میں تحقیق کرنے والے مغربی مصنّفین ہماری تہذیب و تمدّن پر لمبے چوڑے مقالے لکھتے ہیں اور صوفیانہ خیالات کے احیاء میں اتنی گہری دلچسپی لیتے ہیں تو یہ بلاوجہ نہیں۔ جہاں ہماری سائنس، ادب، اسلامیات، تاریخ، فلسفہ اور آرٹ پر لکھی گئی ستّر فیصد کتابیں نجی اور عوامی کتب خانوں میں مسودوں کی شکل میں رکھی ہیں وہاں صوفیانہ مسالک پر موجود تصانیف مختلف شکلوں میں چھپتی ہیں اور بار بار چھپتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اس کے پیچھے کوئی مقصد ہوتا ہے جس کا ہمیں علم نہیں۔ (باقی صفحہ ۵۸ پر)

اگر خدا قیامت کے دن اس ملعون اور مجرم شخص معاویہ کو بخش دے تو پھر کیا بنے گا؟ نہ تو اسے معاف کرو اور نہ اسے سزا دینے کے بارے میں کچھ کہو کیونکہ اگر کل خدا اسے اپنی رحمت سے نوازے تو پھر تمہارا جواب اور تمہارا وظیفہ کیا ہوگا؟ تو پھر کیا کیا جائے؟ ہم کس سے دریافت کریں اور کون جواب دے؟ کون سرگرم عمل ہو کوئی بھی نہیں ہمیں چاہیے کہ انتظار کریں اور دیکھیں کہ خدا کیا کرتا ہے۔

مذہبی پیشوا یہ دلیل بھی پیش کرتے تھے کہ:

"ابوبکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ، زبیر، معاویہ اور یزید[1] رسولِ اکرمؐ کے صحابی تھے اور یا مجتہد تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی تحقیق اور دینی بصیرت کے مطابق عمل کیا۔"

دیندار اور بے دین، ظالم اور مظلوم، دوست اور دشمن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ماہرین کے لیے ضروری نہیں کہ عوام کی آراء پر غور کریں اور نہ ہی عوام کے لیے یہ مناسب ہے کہ دینیات کے عالموں کے معاملات میں دخل دیں۔ خدا ہی حقیقی منصف ہے اور وہ بڑا رحم والا ہے۔ ہمیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ اس بارے میں چون و چرا کریں۔

حکومت کے دفاع میں بعض کٹر مذہبی گروہوں کا کہنا تھا کہ:

(صفحہ ۵۷ سے آگے) اور ہر چیز پر قضا و قدر کی حکومت ہے لیکن ان معاملات پر جو تقدیر حاوی ہے وہ خداوندی منشا اور حکمت نہیں بلکہ زمین پر مسلّط آقاؤں کی مرضی ہے۔

[1] واضح رہے کہ یزید رسولِ اکرمؐ کے وصال کے تقریباً پندرہ برس بعد پیدا ہوا۔

"خدا تک پہنچنے کے اتنے ہی راستے ہیں جتنے کہ انسان ہیں۔ کیا جہاد واحد جواب ہے؟ پنجگانہ نماز دین کا ایک ستون ہے جبکہ جہاد ایک شاخ ہے جس کا تعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے۔ کیا تم خود نماز پنجگانہ کے سلسلے میں تمام قواعد، احکام، وظائف اور شرائط کی پابندی کرتے ہو؟ کیا تم میں سے ان لوگوں نے جو عوام کی رہنمائی کا بیڑا اٹھانا چاہتے ہیں خود اپنی اصلاح کر لی ہے؟ کیا تم نے ایسا مقام حاصل کر لیا ہے کہ تم سے کوئی خطا سرزد نہ ہو یعنی کیا تم نے اپنی نفسانی خواہشات پر قابو پا لیا ہے؟ کیا تم پاک اور پاکیزہ معصوم بن گئے ہو؟ کیا تمہارے معمولی سے معمولی اعمال بھی فقط خدا کی خوشنودی کے لیے ہوتے ہیں؟ کیا تم نے اپنے دین کے اصول اور فروع کا صحیح صحیح ادراک کر لیا ہے؟ کیا تم اب اپنے آپ کو اتنا صالح سمجھتے ہو کہ قوم کی اصلاح کا بار اٹھا سکو؟"

علاوہ ازیں بہشت کے آٹھ دروازے ہیں اور تمہارے لیے ضروری نہیں کہ تم اس میں فقط جہاد کے دروازے سے داخل ہو۔ جہاد بہشت کے دروازوں کو کھولنے کے لیے فقط ایک چابی ہے۔ اس مقصد کے لیے نماز، دوسری عبادات اور مناجات جیسی اور چابیاں بھی ہیں جو نسبتاً زیادہ محفوظ ہیں اور جنہیں کسی نقصان کا خطرہ مول لیے بغیر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں بہت سے ایسے نیک اعمال ہیں جو تمہیں اسی منزل پر پہنچا سکتے ہیں مثلاً بھوکوں کو کھانا کھلانا، غریب خاندانوں کی کفالت کرنا، مقدس مقامات کی زیارت کرنا، زہد و عبادت میں مشغول رہنا، تقویٰ اختیار کرنا، ہمسائے کی مدد کرنا اور مغفرت کی دعا مانگنا وغیرہ۔ ان اعمال کو انجام دے کر

تم اسی مقام پر پہنچ جاؤ گے جس پر انسان جہاد کے ذریعے پہنچتا ہے۔ پھر جہاد کے زیادہ مشکل اور تکلیف دہ عمل سے گزرنے کی کیا ضرورت ہے۔

دعاؤں کے مجموعے پر مشتمل بعض کتابوں میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کتابوں میں درج دعائیں پڑھے تو اسے غزوۂ بدر کے ستّر شہیدوں سے بھی زیادہ اجر اور ثواب ملتا ہے۔ کیا اس سے یہ بات واضح نہیں ہو جاتی کہ انسان کو کونسی راہ عمل اختیار کرنی چاہیے؟

ایک اور گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ ایک مقدس اور دینی شخصیّت کا سیاسی معاملات میں ملوّث ہونا دینِ حق سے انحراف کے مترادف ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے دین کو دولت اور دنیاوی چیزوں کی خاطر دنیا داروں کے ہاتھ بیچ دیا یا دوسرے الفاظ میں دین اور سیاست کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔

ان کا کہنا تھا کہ "کیا رسولِ اکرمؐ نے ایک غزوے سے واپس آتے ہوئے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم ایک چھوٹے جہاد سے واپس آ رہے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور جہاد بھی ہے"۔ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ وہ بڑا جہاد کیا ہے تو آپ نے فرمایا تھا "مبارزہ بانفس"۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ چھوٹے جہاد کو نظر انداز کر کے بڑے جہاد کی جانب توجہ دے یعنی ایک بیرونی دشمن سے نہیں بلکہ اپنی نفسانی خواہشات سے برسرِ پیکار ہو۔

جو صحابہ سربرآوردہ اشخاص اور دینی علماء اور اسکالر حکومتِ وقت کے سہارے دن گزار رہے تھے انہوں نے یوں اظہارِ خیال کیا:

"علیؑ کا طرزِ تفکر عملی نہیں اور اس میں بے حد سخت گیری ہے۔ انسانیت کو مثالیت پسند نہیں بلکہ حقیقت پسند ہونا چاہیے۔ علیؑ دنیا کے ایک بڑے خطّے پر حکومت کرتے ہیں لیکن اب بھی اپنے

جوتے خود مرمت کرتے ہیں۔ وہ ایک عام محنت کش کی طرح کام کرتے ہیں۔ آجکل لوگ جو کچھ دیکھتے ہیں اسی کے مطابق اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ قول بالخصوص اس لیے درست ہے کہ ایران اور روم فتح ہو چکے ہیں اور مسلمانوں نے شہنشاہِ ایران اور قیصرِ روم کے درباروں کی شان و شوکت اور ان کے عالیشان محل اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جیسی زندگی علیؑ گزارتے ہیں ویسی زندگی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ زندگی ایک اسلامی حکومت کے شایانِ شان نہیں۔

کیا علیؑ کا طرزِ حکومت ایران اور روم کے رئیسانہ معاشروں میں برداشت کیا جا سکتا ہے؟ علیؑ نے خلیفہ بننے پر سب کی تنخواہوں کا اِسکیل یکساں کر دیا۔ انہوں نے عثمان ابن حُنیف کو جو ایک بہت بڑے سیاستدان اور علیؑ کے گہرے دوست ہیں فقط تین درہم تنخواہ دی جو ایک غلام کی تنخواہ کے برابر ہے۔"

ان لوگوں کے خیال کے مطابق حضرت علیؑ کا نافذ کردہ معاشی نظام ناقابلِ عمل تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

"ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب ایران (جو کہ اب اسلامی قلمرو کا حصّہ ہے اور علیؑ کے زیرِ تسلّط ہے) کا بادشاہ خسرو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے آرہا تھا تو یہ خیال کرتے ہوئے کہ حالتِ جنگ میں ہونے کی وجہ سے کم سے کم تکلّفات برتے جائیں، وہ فقط سات ہزار عورتیں، غلام، خدمتگار اور سازندے اپنے ساتھ لایا تھا۔"

ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ:

"ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ آیا اس کا یہ فعل صحیح تھا یا غلط تھا۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر علیؑ کو ناکامی ہوئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا مکتبِ فکر عملی نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو زمانے کے حالات اور معاشرتی حقیقتوں سے ہم آہنگ نہ کر سکے۔ وہ سیاستدان نہیں تھے۔ وہ ماہرِ عمرانیات بھی نہیں تھے۔ انہوں نے ہر ایک کو ناخوش کیا۔ وہ بے حد سخت گیر تھے۔ انہوں نے کبھی بھی ممتاز شخصیتوں، قبائل کے سرداروں اور اشراف اور رؤسا کے سامنے عاجزی اختیار نہیں کی۔"

انہوں نے یہ بھی کہا کہ:

"تمہیں خلافت کا مقابلہ امامت اور نبوّت سے نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں معاویہ اور یزید کا موازنہ رسولِ اکرمؐ اور علیؑ سے نہیں کرنا چاہیے۔ تمہیں ان کا موازنہ قیصر و کسریٰ سے کرنا چاہیے۔ دمشق کا موجودہ محل جسے قصرِ خضراءؑ کا نام دیا گیا ہے اور جس پر بیت المال کی خطیر رقم خرچ کی گئی ہے وہ مقام ہے جہاں سے اسلامی شہنشاہیت روم، ایران وغیرہ پر حکومت کرتی ہے۔ تاہم یہ محل اتنا شاندار بھی نہیں جتنا قیصر کی طرف سے مقرر کردہ شام کے گورنر کا ہوا کرتا تھا۔"

مذکورہ بالا اشخاص کا کہنا تھا کہ:

"علیؑ کے پیرو سمجھتے ہیں کہ وہ اب بھی رسولِ اکرمؐ کے زمانے کے مدینہ شہر میں رہ رہے ہیں اور "مہذب" رومی اور ایرانی

جو اسلامی دنیا میں شامل ہوئے ہیں مہاجرین اور انصار ہیں"

اس پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی کہا کہ:

"ہمیں زیر بحث مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو مدِّ نظر رکھنا چاہیے۔ صحیح عبادت اور کاملیت مثالی چیزیں ہیں لیکن تمہیں حقائق پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ غریب پسماندہ مسلمانوں کو جو دنیا کے ایک اہم حصّے پر حکومت کر رہے ہیں یہ باور کرانا مشکل ہے کہ مشرق اور مغرب میں واقع دو سلطنتوں میں سے ایک کے رہنے والے اس طرح زندگی بسر کریں جس طرح وہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں زندگی بسر کرتے تھے اور ان کا طرزِ عمل ایسا ہو جیسا علیؑ کا ہے کیونکہ زندگی کے معیارات میں ترقی ہو گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مہذب، ایران اور روم کی رسوم، قواعد، آدابِ محفل، معاشی نظام، افکار و خیالات، ذوق و شوق، ادب، رقص و سرود، تفریحات، سماجی تعلقات، اخلاقیات، طبقاتی نظام، شاہانہ طرزِ حکومت، راہبانہ اور پادریانہ روایات اور سب سے بڑھ کر ایران اور روم کی ترقی یافتہ تہذیبوں نے سیدھے سادے مسلمانوں کو متاثر کیا۔

مسلمانوں کو اپنی فتوحات کے نتیجے میں جو مال و دولت، قوت اور مقام حاصل ہوا اس نے انہیں مغرور کر دیا اور یہی وجہ ہوئی کہ اب وہ حضرت علیؑ کے پند و نصائح ہدف اور موعظتوں کی جانب کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ لوگوں کی اکثریت صورتِ حال سے خوش اور مطمئن تھی۔ انہیں اب اس قسم کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور ان کے دلوں پر آپ کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ دراصل لوگ اب دولت اور طاقت کے بندے بن گئے تھے اور جنہوں نے

اپنا آپ نہیں بدلا انہیں تلوار کا سامنا کرنا پڑا۔

کیا آپ کو یاد ہے کہ امام علیؑ پر مدینہ میں ان لوگوں کے ہاتھوں کیا بیتی جو اُن کے دوست اور ساتھی تھے اور ان کے پہلو بہ پہلو جنگوں میں شامل رہے تھے؟ جیسا کہ آپ کو علم ہے بنی امیّہ مدینہ یا سقیفہ میں موجود نہیں تھے۔ کیا آپ کو امام علیؑ اور امام حسنؑ کی افواج کے وہ سربرآوردہ افسر یاد ہیں جن کا ماضی بڑا شاندار تھا لیکن وہ عین اس وقت معاویہ کے ہاتھوں بک گئے جب گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا اور انہوں نے معاویہ کی خاطر اپنے آپ کو اور اپنے ایمان، سابقہ خودداری اور اپنے ماتحت سپاہیوں کو کتنی زک پہنچائی؟

خوارج بنی امیہ کے خاندان میں سے نہیں تھے اور نہ ہی ان کا اموی حکّام سے کوئی تعلق تھا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بنی امیہ اور ان کے اقتدار کے جانی دشمن تھے۔ ان سب کا تعلق عوام سے تھا اور وہ دیہاتی علاقوں کے معمولی تجارت پیشہ لوگ تھے۔ کسی زمانے میں وہ زہد و عبادت کا نمونہ رہے تھے۔ اور انہوں نے بڑی ریاضت کی تھی لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ کس طرح غیر شعوری طور پر بنی امیہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے۔ انہیں بالواسطہ طور پر دمشق سے اکسایا گیا اور انہوں نے امام علیؑ کی مخالفت شروع کر دی۔ جب جنگ بڑے نازک مرحلے پر تھی انہوں نے علیؑ سے بحث مباحثہ کیا اور پھر ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ یوں وہ دشمن کے بلا تنخواہ ملازم بن گئے اور انہیں علیؑ کو شکست دینے کے لیے استعمال کیا گیا۔ وہ نیک اور دیندار لوگ تھے جنہوں نے علیؑ پر الزام لگا کر ان کی شان میں گستاخیاں کر کے اور ان سے قطع تعلق کر کے انہیں کمزور کیا۔

چونکہ عمرو ابن عاص جیسے رسوائے زمانہ اشخاص جنہیں لوگ اچھی طرح جانتے تھے حضرت علیؑ کی دینی اور روحانی شہرت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے

لہٰذا انہوں نے لاتعلقی کا حربہ استعمال کرکے انہیں زک پہنچانے کی کوشش کی اور جیساکہ ہم جانتے ہیں بالآخر اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر انہیں قتل کرانے میں کامیاب ہوگئے۔

ان تجربات کی روشنی میں انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ "کیا کرنا چاہیے؟" کے سوال کا جواب ہے "کچھ بھی نہیں"۔ ان لوگوں کے لیے حضرت علیؑ کے مقابلے میں معاویہ زیادہ موزوں تھا۔ معاویہ کی تمام کمزوریوں اور انحرافات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ موجودہ زمانے کے مفکرین سے مشابہت رکھتا تھا اور حضرت علیؑ سے زیادہ حقیقت پسند تھا۔ حضرت علیؑ یہ چاہتے تھے کہ لوگ تقویٰ اختیار کریں اور معقول زندگی بسر کریں جو کہ ناممکن تھا۔ اس کے برعکس معاویہ کی حکومت گو ظالم و فاسد تھی اور لوگوں میں امتیاز برتتی تھی لیکن اس نے قوم کو نہایت تیزی سے آگے بڑھایا۔ اپنی آزاد اور لاپرواطبیعت کے ساتھ اس نے ایرانی اور رومی تہذیبوں کے تمام طور طریقے اپنا لیے۔ اپنے بیس سالہ دورِ اقتدار میں داخلی مشکلات پر قابو پانے اور ابوذرؓ، علیؑ، حسنؑ اور حجرؓ وغیرہ جیسی شخصیتوں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اس نے اسلام کے دارالحکومت کو ایک جدید اور ترقی یافتہ شہر بنا دیا۔ اس نے بحیرۂ روم میں ایک بحری جنگی بیڑا تیار کیا۔ قبرص پر قبضہ کیا اور بازنطینی سلطنت پر مسلسل حملے جاری رکھے۔

معاویہ کے قصرِ خضراء کی تیاری میں رومی طرزِ تعمیر اختیار کیا گیا اور اس کی آرائش ساسانی طرز پر کی گئی۔ چند بدو عرب غلاموں کی بجائے اس نے رومی رقاصوں اور بہترین سازندوں پر مشتمل ایک آرکسٹرا کا اہتمام کیا۔ اس نے قیصر و کسریٰ کے درباروں کی رسوم و روایات کی نقل اتاری اور لباس، خوراک، تفریح، آرائش، موسیقی، شاعری، ادب، طرزِ رہائش، شہری منصوبہ بندی، محلّات، سماجی اور سیاسی نظام غرضیکہ ہر چیز کو سادہ

عربی طرز سے بدل کر 'ترقی یافتہ' اور 'انقلابی' رومی رنگ و روپ بخشا۔

حق اور باطل اور ظلم اور عدل کی بحث میں پڑے بغیر اور اس بات سے قطع نظر کہ آیا حضرت علیؑ حق بجانب تھے یا معاویہ کا رویہ درست تھا یہ کہا جا سکتا ہے کہ بادیُ النظر میں تعمیر و ترقی اور تہذیب و تمدّن کے لحاظ سے بہت کچھ کیا گیا۔ اور کیا جاتا رہا اور دارالحکومت کی تعمیرِ نو اور خلیفہ کے محلّات اور شاندار طرزِ رہائش عیسائیوں اور مجوسیوں کی نظروں میں اسلام کی عزت و وقار کا نشان تھے۔

رومی اور ایرانی سلطنتوں کے ساتھ حضرت علیؑ کے طرزِ حکمرانی کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا جاتا تھا کہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بنی امیّہ کی نئی حکومت لوگوں کی بہتر خدمت کر رہی ہے اور ان کے لیے زیادہ مفید ہے۔ انہوں نے لوگوں کے لیے زیادہ آسانیاں پیدا کی ہیں اور انہیں بہتر طرزِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے۔ وہ اسلام کے لیے عزّت، قوّت، مالِ غنیمت، فتوحات، اچھی شہرت اور اہمیت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ بہت سے آتشکدوں اور کلیساؤں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب مشرکین سے آباد شہروں میں 'اللہ اکبر اور لآ الٰہ' کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ مالِ غنیمت اور دوسری کثیر دولت بیت المال میں آ رہی ہے۔ گو یہ دولت صحیح طریقوں سے (یعنی عدل کے معیار اور اسلامی اصولوں کے مطابق) حاصل نہ بھی کی گئی ہو لیکن یہ اسلامی ممالک میں خرچ کی جا رہی ہے اور کئی ایک مسلمان اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ علاوہ ازیں ان فتوحات کی بدولت نوجوانوں کو روزگار کے نئے مواقع، اشراف کو نئے عہدے اور عام مسلمانوں کو نئے نئے کاروبار میسّر آ رہے ہیں۔

لہٰذا اس سوال کے جواب میں کہ "کیا کرنا چاہیے؟" وہ لوگ جواب دیتے تھے کہ:

"رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں رائج اسلام کے انقلابی معیارات پر نظرثانی کرنی چاہیے۔ زمانہ بدل چکا ہے اور اب اسلام کے محور فقط مکّہ اور مدینہ نہیں ہیں۔ اب اسلامی مملکت روم سے ایران تک پھیل چکی ہے۔ لہٰذا اسے علیؑ کی مثالی تمناؤں اور سخت گیرانہ طور طریقوں کا پابند نہیں ہونا چاہیے جن کا مقصد مکمّل عادلانہ نظام کا قیام ہے۔"

چنانچہ یہ لوگ بھاگ بھاگ کر معاویہ کے پاس پہنچے۔ کسی قیصر یا کسی بادشاہ کے محکوم لوگوں سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی تھی؟ ان کا کہنا تھا کہ:

"تمہیں موجودہ حالات پر حقیقت پسندانہ نگاہ ڈالنی چاہیے تمہیں تسلیم کرنا چاہیے کہ بنی امیہ کی طاقت، سیاست، ذکاوت اور دولت اسلام کے نام پر، اس کی ترقی کی خاطر اور دنیا میں اس کی رسوم کو رواج دینے کے لیے خرچ ہو رہی ہے۔ یہ حکومت کافرانہ ادیان کے خلاف جدّوجہد کر کے اسلام کا وقار بلند کر رہی ہے اور قرآن اور رسولؐ کا پیغام آگے بڑھا رہی ہے۔ یہ حکومت ملّتِ اسلامیہ کی تہذیب کو ترقی دے رہی ہے۔ شہر آباد کر رہی ہے، معیارِ زندگی بلند کر رہی ہے، رفاہِ عامّہ کے کام کر رہی ہے، دولت حاصل کر رہی ہے اور مشرق اور مغرب کی عظیم تہذیبوں کی اسلامی تہذیب سے مطابقت پیدا کر رہی ہے۔"

لہٰذا اگر ہم سے پوچھا جائے کہ اب کیا کرنا چاہیے تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ہماری طرح بنی امیہ کے بھی خواہوں میں شامل ہو جانا چاہیے۔ ہم نے دیکھ لیا

ہے کہ مزاحمت، داخلی لڑائیاں، سیاسی کشمکش اور حق، عدل، امامت، انتخاب، فضیلت، تقویٰ، عصمت، روایات اور بدعت کے بارے میں بحث و تمحیص بے سود ہے اور اس کا نتیجہ وقت کا ضیاع ہے۔

علاوہ ازیں جب اموی خلیفہ نصرانیوں اور مجوسیوں جیسے بددین خارجی دشمنوں سے برسرِ پیکار ہو تو کوئی داخلی محاذ نہیں کھولنا چاہیے کیونکہ ایسا کرنے سے اسلام کی حکومتی قوت کمزور ہو جائے گی اور اس کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو گی۔

ہم سب کو چاہیے کہ حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے آپس کے سیاسی جھگڑے ختم کر دیں۔ عزلت گزینی، صوفی منشی اور پرہیزگاری اختیار کریں اور موجودہ حقیقت کو قبول کرتے ہوئے اموی حکومت کی حمایت کریں تاکہ وہ اسلام کی خدمت کر سکے۔ جہاں تک انحراف کا تعلق ہے ہمیں چاہیے کہ ان کی اصلاح کریں۔ موجودہ حالات میں ہمارا کردار کیا ہونا چاہیے؟ اس کا واضح جواب یہی ہے کہ ہمیں رائج حکومتی نظام کی حمایت کرنی چاہیے۔

اس طرح ہم جہاں ایک جانب تو ناداروں کی خدمت کر سکتے ہیں، مظلوموں کو ان کا حق دلا سکتے ہیں، محتاجوں کی مدد کر سکتے ہیں، مذہب کے احکام بجا لا سکتے ہیں اور اس کی تبلیغ کر سکتے ہیں، اپنے نظریات کو تقویت پہنچا سکتے ہیں، معاشرے کی اصلاح کر سکتے ہیں، آئندہ پیدا ہونے والی خرابیوں کا سدِ باب کر سکتے ہیں اور حکومت کی مشینری کا حصّہ بن کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں اور دوسری جانب صورت یہ ہے کہ ہجرت کو ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ علیؑ کا مجوزہ انقلاب ناکام ہو چکا ہے۔ حسنؑ جو ظلم و تشدّد، جہالت اور عوام دشمن رسوم و رواج کی مخالفت کرنے والے آخری پیشوا تھے بالآخر معاویہ کے

ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہو گئے اور بعد میں اس نے انہیں زہر دلا دیا۔ لہٰذا اب صورتِ حال بدلنے کی ہر کوشش بے سود ہے۔ اب ہمیں مذہبی مسائل فقہ اور تہذیب وغیرہ کی طرف توجہ دینی چاہیے تاکہ ان کے ذریعے لوگوں کو اسلامی افکار اور حقائق سے روشناس کرا سکیں اور وہ قرآن مجید کے روحانی پہلوؤں اور علمی اسرار سے واقف ہو سکیں۔

ہمیں فقط الٰہی علم و دانش، فلسفہ، اسرارِ قرآن، خطابت، فصاحت و بلاغت، معانی، اسلوبِ بیان، قرآن کی جمع آوری اور تعلیم، رسولِ اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ، غزوات اور سرایا، فقہ، دینیات وغیرہ کی تحقیق میں مصروف رہنا چاہیے۔ ہمارا مشغلہ صرف تحقیق، دینیات اور دینی رسوم کی تعلیم اور تبلیغ اسلامی تہذیب کی ترقی اور امت مسلمہ کی ذہنی اور علمی خدمت ہونا چاہیے۔

بڑی حیرت کی بات ہے کہ روشن خیال اشخاص یعنی حضرت علیؑ کے پیروؤں حتیٰ کہ حضرت علیؑ کے اہلِ خاندان اور ان لوگوں کے نزدیک بھی جو خانوادۂ رسولؐ کے قریب تھے اور اس سوال کا کہ "وہ کیا کرنا چاہیے؟" یہی جواب تھا کہ "کچھ نہیں کرنا چاہیے"۔ کیونکہ جو قدم بھی اٹھایا جائے گا اس کا نتیجہ شکست کی شکل میں برآمد ہوگا۔ ان کے خیال کے مطابق صورتِ حال ہابیل اور قابیل کے قصے کی مانند تھی۔ وہ کہتے تھے کہ خالی ہاتھ تلوار کے مقابل ڈٹ جانا ہرگز جائز نہیں اور جو ایسا کرے وہ سزا کا مستوجب ہے کیونکہ کیا یہ حکم نہیں دیا گیا کہ "خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو"۔ جب انسان کا مقدر اور اس کی موت ایک طے شدہ امر ہو تو جہاد خودکشی کے مترادف ہے۔ اس قسم کے اقدام سے ظالم اور بددین اشخاص کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک بیکار

چیز ہے [1]

چنانچہ انہوں نے یہی مشورہ دیا کہ خاموش رہا جائے اور اپنے آپ کو عوام کو دینی تعلیم دینے، قرآن مجید پڑھانے، فقہی مسائل کی چھان بین کرنے اور احادیثِ رسولؐ بیان کرنے میں مشغول رکھا جائے۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ تمام طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ جن میں برسرِ اقتدار طبقہ کے حامی عالموں اور اسکالروں کے علاوہ شیعہ یعنی روشن خیال آدمی بھی شامل تھے جو حقیقت سے بخوبی آشنا تھے اور جن کا معاشرتی، ذہنی اور سیاسی نقطۂ نگاہ بالکل واضح تھا۔ ہجرت کے ساٹھ سال بعد اس خیال پر متفق ہو گئے تھے کہ اب صورتِ حال کو بدلنے کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا۔

جب ہر طرف سے "نہیں" کی آوازیں آ رہی تھیں ایک شخص نے — ایک یکہ و تنہا شخص نے — کہا "ہاں" ؎

تو بشر کی ہمّتِ عالی کا وہ اعجاز ہے
جس پہ یزداں و بشر دونوں کو اب تک ناز ہے
(جوشؔ)

اس "ہاں" کا مطلب کیا تھا؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ظلم و ستم کے دور میں جب کہ سب آوازیں دبا دی گئی ہیں ایک شخص اپنے فرض کی آواز پر لبیک کہہ رہا ہے۔ وہ خالی ہاتھ ہے۔ اس کے پاس ساز و سامان

---

[1] یہ یاد رکھنا چاہیے کہ امام حسینؑ کے مخلص اور ہمدرد قرابت داروں نے بھی انہیں اس سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ان میں آپ کے سوتیلے بھائی محمد بن حنفیہ اور حضرت زینبؑ کے شوہر عبداللہ ابن جعفر بھی شامل تھے۔

نہیں لیکن اس کے باوجود جب اس کا فرض اسے پکار رہا ہو وہ خاموش نہیں رہ سکتا ـــــ اور وہ فرض ہے ایک نظریے کے لیے جہاد ـــــ یہ ہستی کون ہے؟ یہ ہستی حسینؑ ابن علیؑ کی ہے۔

امام حسینؑ جب تک زندہ ہیں ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ نظریۂ اسلام کی خاطر جہاد کریں۔ یہ درست ہے کہ ان کے پاس نہ لشکر ہے نہ ساز و سامان دوسرے الفاظ میں وہ جہاد کرنے کے قابل نہیں ہیں لیکن اس فرض کی ادائیگی کے لیے قابلیت نہیں بلکہ زندگی شرط ہے اور امام حسینؑ سے بڑھ کر اور کون زندہ ہو سکتا ہے؟ ہماری تاریخ میں زندگی کا اہل ہونے کا امام حسینؑ سے زیادہ اور کون حقدار ہے؟

آگاہی، ایمان اور زندگی انسانیت کی روح ہیں جو انسان پر جہاد کی ذمہ داری عائد کرتی ہے اور امام حسینؑ انسانیت کی زندگی، محبوبیت اور آگاہی کی بہترین مثال ہیں۔

قابلیت یا ناقابلیت، ناتوانی یا قوت، تنہائی یا کثرتِ لشکر وغیرہ فقط انسان کے مشن کی شکل و صورت اور ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا طریقہ متعین کرتی ہیں لیکن یہ طے نہیں کرتیں کہ آیا اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ضروری ہے یا نہیں۔

لہٰذا امام حسینؑ کے لیے ضروری تھا کہ وہ جنگ کریں۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ یا ساز و سامان نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ان پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ باطل سے برسرِ پیکار رہیں۔ انہوں نے اپنے فرض کی پکار پر لبیک کہا اور وہ واحد شخص تھے جنہوں نے وقت کے اہم ترین سوال کا جواب اثبات میں دیا وہ تنہا تھے اور مدینہ چھوڑ کر مکہ آ چکے تھے۔ یہ حج کا

زمانہ تھا جب لوگ اطراف واکناف سے لبیک کہنے کے لیے خانہ کعبہ کے اردگرد جمع ہو رہے تھے۔

اور اب جبکہ امام علیہ السلام نے فقط آدھے مناسکِ حج ادا کیے تھے وہ مکہ بھی چھوڑ رہے تھے۔ وہ وہاں سے نہایت عجلت میں روانہ ہو رہے تھے کیونکہ وہ دنیا پر واضح کر دینا چاہتے تھے کہ وقت کے سوال کا جواب کیا ہے اور وہ کیسے دیا جانا ہے۔

ہجرت کے بعد ساٹھ سال اور رسولِ اکرمؐ کے وصال کے بعد پچاس سال گزر چکے تھے اور دین اسلام کے سبھی جانباز ناپید ہو چکے تھے۔ علیؑ موجود نہیں تھے، حسنؑ موجود نہیں تھے، ابوذرؓ اور عمارؓ موجود نہیں تھے۔ دوسری نسل کے مجاہدین میں سے حجرؓ موجود نہیں تھے۔ ان کے ساتھیوں کا قتلِ عام ہو چکا تھا۔ صلیبیں اکھاڑی جا چکی تھیں اور ان پر لگا ہوا شہیدوں کا خون دھل چکا تھا۔

افکار و خیالات نے مایوسی، ابہام، انحطاط، انحراف، خاموشی اور خوف کا روپ دھار لیا تھا۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ابو ہریرہ، ابو موسیٰ اور ابو درداء جیسے لوگ جنہوں نے اسلامی انقلاب کے سنہری دور میں بڑا افتخار اور بڑی عزت حاصل کی تھی قعرِ مذلّت میں گر چکے تھے اور انہوں نے لادینیت اور ظلم و جور سے علانیہ گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔

جانباز صحابہ اور مہاجرین اب بیت المال پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور کھانا کھا کھا کر ان کے پیٹ پھولے ہوئے تھے۔ مجاہدین کے ہاتھ اور ہتھیار اب جلادوں کی ملکیت تھے اور وہ خود بیکسی اور ناداری کا لبادہ اوڑھ کر یزید کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ دمشق سے خراسان تک قتلِ عام، خیانت، سازشوں اور

بدعہدیوں کا جال بچھا ہوا تھا اور سانسیں سینوں کے قفس میں بند تھیں۔

اب وقت کو ایک مردِ مجاہد کا انتظار تھا۔ ہر چیز ایک ایسے شخص کی منتظر تھی جو ان اقدار کا مجسمہ ہو جنہیں ملیامیٹ کیا جا رہا تھا۔ ہجرت کے ساٹھ سال بعد ایسا وقت آگیا تھا جب ہر چیز ملیامیٹ ہو رہی تھی اور انقلاب کے مقاصد کو تباہ کیا جا رہا تھا۔ لوگوں میں مایوسی کی لہر دوڑ چکی تھی۔ تاریخ میں بعض اوقات ایسے مرحلے بھی آتے ہیں۔

اس تاریک دور میں زمانۂ جاہلیت کی اشرافیت کو دوبارہ زندہ کیا جا رہا تھا۔ طاقت کو تقویٰ اور تقدّس کا لباس پہنایا جا رہا تھا۔ اسلام نے جبر و تشدد کا تختۂ مشق بننے والے مظلوم انسانوں کے دلوں میں آزادی اور مساوات کی جو خواہشات پیدا کی تھیں وہ دم توڑ رہی تھیں۔ انسانی ہمدردی پر مبنی لائے گئے اسلامی انقلاب کی جگہ قبائلی جہالت نے لے لی تھی۔ کتابُ اللہ کو فریب کے نیزوں کی نوکوں پر چڑھا دیا گیا تھا۔ مسجدوں کے میناروں سے بے دینی کی دعوت دی جانے لگی تھی۔ گو سائۂ سامری لوگوں کو توحید کی جانب بلا رہا تھا۔ نمرود نے ابراہیمؑ کی جگہ لے لی تھی۔ قیصر رسول اللہؐ کا عمامہ اوڑھے ہوا تھا۔ جہاد میں استعمال ہونے والی تلوار جلاد کے ہاتھ میں تھی۔ لادینیت کے خلاف استعمال کی گئی مجاہدین کی کاوشیں بیکار ہو چکی تھیں۔ ان کی جگہ منافقین نے خزانوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ جہاد کا نام لیکر قتلِ عام کیا جا رہا تھا۔ مذہب کے عائد کردہ ٹیکسوں کو لوٹ مار کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ نمازیں لوگوں کو فریب دینے کیلیے پڑھی جاتی تھیں۔ لادینیت پر توحید کا پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ اسلام کو لوگوں پر تسلّط حاصل کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ قرآن کی غلط تاویلیں کر کے لوگوں کو گمراہ کیا جا رہا تھا اور احادیث وضع کر کے رسولِ اکرمؐ سے منسوب کی جا رہی تھیں۔

ظلم کی تلوار ایک دفعہ پھر لوگوں کے سروں پر چمک رہی تھی۔ عوام کو پہلے کی

طرح غلام بنایا جا رہا تھا۔ آزادی کو دائمی زنجیر میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔ خیالات کو مقیّد کیا جا رہا تھا اور آوازوں کو خاموش کر دیا گیا تھا۔ زبانیں یا تو سونے کے عوض خرید لی گئی تھیں یا زبردستی گنگ کر دی گئی تھیں اور یا تلوار کی دھار سے کاٹ دی گئی تھیں۔

صحابہ نے ایمان، جہاد اور انقلاب کے دور میں جو آبرو اور مقام جان کی بازی لگا کر حاصل کیا تھا وہ انہوں نے بہت سستے داموں بیچ کر عہدے اور حکومتیں حاصل کر لیں۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے کھلم کھلا مخالفت کرنے کی بجائے گوشہ نشینی اختیار کی اور زہد و عبادت میں مصروف ہو کر آبرومندانہ طریقے سے اپنی جان کی حفاظت کی اور یوں لادینیت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

اب مذہب اور دنیا دونوں لادینیت اور جبر و تشدد کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ تلواریں ٹوٹ چکی تھیں۔ گلے کٹ چکے تھے۔ صلیبیں اکھاڑ دی گئی تھیں اور خون دھو دیا گیا تھا۔

انقلاب کی لہریں، احتجاجی چیخ پکار اور انقلاب کے شعلے خاموش ہو چکے تھے۔ جوش و خروش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ خوف کے سائے شہیدوں کی قبروں اور زندہ انسانوں کے خنک اور خاموش قبرستانوں پر چھائے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے امید اور ایمان کے ویرانے میں ایک اللّٰہ کی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔

جدید جہالت نے آسمان تک کو تیرہ و تار کر دیا تھا۔ یہ جہالت سابقہ جہالت سے بھی زیادہ وحشیانہ تھی۔ اس دفعہ دشمن پہلے دشمن کے مقابلے میں زیادہ ذہین، زیادہ کامیاب اور زیادہ ہوشیار تھا۔ ذی فہم لوگ ان انقلابی (یا باغی) مجاہدوں کے انجام سے سبق حاصل کر چکے تھے جنہیں شکست اور شہادت سے دوچار ہونا پڑا۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اچانک ایک شعلہ نمودار ہوا جس نے آنکھوں

میں چکا چوند پیدا کر دی۔ یہ زمین پر چلتے پھرتے ایک شہید کا نورانی پیکر تھا۔ اندھیرے کی گہرائیوں اور فتنہ و فساد اور مایوسی کی ظلمتوں میں اُمّید کی ایک کرن نظر آئی۔

ایک دفعہ پھر حضرت فاطمہؑ کے خاموش اور مغموم چھوٹے سے گھر سے جو درحقیقت پوری انسانی تاریخ سے بھی بڑا ہے ایک شخص اٹھا۔ یہ ایک ایسا غضبناک اور پرعزم انسان تھا جو جور و ستم کے تمام ایوانوں اور قوّت کے تمام محاذوں سے ٹکّر لینے کو تیار تھا۔ وہ ایک ایسے پہاڑ کی مانند تھا جس کے سینے میں بے پناہ لاوا دبا ہوا ہو یا اس طوفان کی مانند تھا جو خدا نے قومِ عاد پر بھیجا تھا۔

جی ہاں! حضرت فاطمہؑ کے گھر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اس نے مدینہ اور مسجدِ نبوی پر نگاہ ڈالی۔ مکہ اور خانۂ کعبہ دیکھا جسے اب نمرود نے زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کا تصوّر کیا۔ رسولِ اکرمؐ کے پیغام کو دل میں دہرایا اور دمشق کے قصرِ خضرا اور بھوکوں اور غلاموں کے بارے میں سوچا۔

حضرت فاطمہؑ کے گھر سے ایک شخص برآمد ہوا۔ تمام فرائض کا بوجھ اس کے کندھوں پر تھا۔ وہ حق کی خاطر صعوبتیں سہنے والے عظیم انسان کا وارث تھا۔ وہ آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمدؐ کا وارث تھا ـــــ ایک تنہا شخص۔ لیکن نہیں ـــــ وہ شخص بالکل تنہا نہیں تھا۔ ایک خاتون بھی حضرت فاطمہؑ کے گھر سے نکلی۔ وہ اس شخص کی بہن تھی اور اپنے بھائیؑ کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر چل رہی تھی کیونکہ اپنے بھائی کی ذمہ داری کا آدھا بوجھ اسے اٹھانا تھا۔

ایک شخص حضرت فاطمہؑ کے گھر سے برآمد ہوا۔ اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ وہ خالی ہاتھ دہشت انگیزی، ظلمت اور تلوار کا مقابلہ کرنے نکلا تھا۔ اس کے پاس صرف ایک ہتھیار تھا اور وہ ہتھیار تھا موت ـــــ لیکن اسکا تعلق ایک ایسے خانوادے سے تھا جس نے عزت و آبرو کے ساتھ مرنے کا ڈھنگ سیکھ رکھا تھا۔

دنیا بھر میں اس جری سے بڑھ کر بہترین موت کا طریقہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا طاقتور دشمن جو مسندِ اقتدار پر بیٹھا تھا اس راز سے واقف نہیں تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ یہ تنہا شخص اس قدر پرعزم تھا اور اسے دشمن کے بہت بڑے لشکر پر فتح پانے کا پورا یقین تھا۔

شہادت کا یہ عظیم معلم لوگوں کو یہ بتانے کے لیے اٹھا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے کہ جہاد فقط اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب لڑ کر فتح سے ہمکنار ہونے کی قابلیت موجود ہو۔ اسے دنیا پر واضح کرنا تھا کہ شہادت پاکر انسان نقصان میں نہیں رہتا بلکہ یہ ایک ایسا انتخاب ہے جس کی بدولت ایک جانباز آزادی کی عبادت گاہ کی دہلیز اور محبت کی قربان گاہ پر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے کامیاب اور فتح مند ہو جاتا ہے۔

امام حسینؑ جو حضرت آدمؑ کے وارث ہیں جن کی بدولت نوع بشر نے زندگی پائی اور ان انبیائے کرامؑ کے جانشین ہیں جنھوں نے لوگوں کو جینا سکھایا اب یہ بتانے کے لیے میدان میں اترے کہ مرنا کیسے چاہیے۔ ؎

جی کے مرنا تو سب کو آتا ہے
مر کے جینا سِکھا دیا تو نے

امام حسینؑ نے بتایا کہ ذلّت کی موت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو زندہ رہنے کی خاطر تحقیر برداشت کرتے ہیں۔

جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کی اعلیٰ ترین شکل لفظ 'شہید' میں نظر آتی ہے۔ اس کے معنی ہیں موجود ہونا، گواہی دینا اور گواہی دینے والا۔ اس کے معنی معقول اور قابلِ فہم کے بھی ہیں جس کی طرف سبھی رجوع کریں اور بالآخر اس سے مراد ہے قابلِ تقلید نمونہ یا اعلیٰ مثال۔

شہادت

کھڑا ہو کر گواہی دینے کو ہماری تہذیب اور ہمارے مذہب میں ایک خونریز اور ناگہانی واقعہ نہیں سمجھا جاتا۔ ہمارے مذہب اور قبائلی تواریخ کے مطابق شہادت کا مطلب ان سورماؤں کی قربانی ہے جو دشمن کے خلاف جنگ کرتے ہوئے مارے جاتے ہیں۔ اسے مصیبت سے بھرپور ایک المناک واقعہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ جو لوگ اس طرح مارے جائیں انہیں شہید اور ان کی موت کو شہادت کہا جاتا ہے۔

تاہم ہماری تہذیب کے مطابق شہادت ایک ایسی موت نہیں جو دشمن نے ہمارے جانبازوں پر مسلّط کی ہو بلکہ ایک ایسی موت ہے جس کی ہمارا دلاور سپاہی تمنّا کرتا ہے اور ایک انسان کو حاصل تمام تر آگاہی، منطق، عقل و دانش، ذکاوت، فہم، احساس اور ہوش کے ساتھ اس کا انتخاب کرتا ہے۔

امام حسینؑ نے جو اقدام کیا اس پر نظر ڈالیے۔ انہوں نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ گھر بار چھوڑا اور مرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ دشمن کی برائیوں کو طشت از بام کرنے کے لیے اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہ تھا انہوں نے اس طریقۂ کار کا انتخاب کیا تاکہ حکومتِ وقت کے مکروہ چہرے پر جو فریب زدہ پردے پڑے ہوئے ہیں انہیں نوچ پھینکیں۔ اگر وہ یہ اقدام کر کے دشمن کو شکست نہیں دے سکتے تھے تو کم از کم اسے ذلیل و خوار تو کر سکتے تھے۔

امام علیہ السلام غیر مسلح تھے۔ وہ تن تنہا تھے اور انہیں کسی لشکر کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ تاہم جہاد ان پر فرض تھا۔ انہوں نے شہادت کی موت کا انتخاب

کیا کیونکہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ان کے پاس یہی چارۂ کار تھا۔

حسینؑ ہونے کے ناطے ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ ہر برائی اور ظلم کے خلاف جہاد کریں۔ اس جہاد کے لیے موت کو گلے لگانے کے علاوہ ان کے پاس کوئی ساز و سامان نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے جان کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا اور اپنی قربانگاہ میں پہنچنے کے لیے گھر چھوڑ دیا۔

ہم جانتے ہیں کہ انہوں نے اپنی روانگی، نقل و حرکت اور ہجرت کا منصوبہ کس قدر احتیاط اور عمدگی سے ترتیب دیا۔ وہ منزل بہ منزل آگے بڑھتے رہے اور اپنے سفر کے مقصد کا اعلان کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے اہلِ خاندان اور ساتھیوں کا بہترین انتخاب کیا۔ انہوں نے ان لوگوں کو اپنے ساتھ لیا جنہیں علم تھا کہ وہ اپنے عظیم پیشوا کے ساتھ مرنے جا رہے ہیں۔ دنیا میں یہی کچھ ان کی متاعِ عزیز تھی اور اسے وہ شہادت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانے لے جا رہے تھے۔

اس دین کا مقدر جو تباہ کیا جا رہا تھا اور ان لوگوں کا نصیب جو اسلامی عدل اور آزادی کے خواہاں تھے لیکن دورِ جہالت کی غلامی سے بھی بدتر زنجیروں میں جکڑے گئے تھے اب امام علیہ السلام کے اقدام کے منتظر تھے۔

ان کے پاس نہ تو کوئی اسلحہ تھا اور نہ ہی کوئی اور ساز و سامان تاہم وہ اپنی تمام تر متاع یعنی اپنے اہلِ خاندان اور اپنے عزیز ترین ساتھیوں کو ساتھ لے آئے تھے تاکہ ان کی شہادت اس امر کی گواہی دے کہ امام علیہ السّلام نے اس وقت جب حق بے یار و مددگار تھا اپنا فریضہ ادا کر دیا۔

یہ تو آپ نے سنا ہی ہو گا کہ روزِ عاشورا امام حسینؑ نے اپنے چھ ماہ کے بچے علی اصغرؑ کا خون اپنے ہاتھوں میں لے کر آسمان کی طرف اچھالا اور کہا:

"اے پروردگار! گواہ رہ اور میری قربانی قبول فرما۔"

ایسے ہی مواقع ہوتے ہیں جب ایک فردِ واحد کی موت ایک قوم کی زندگی کی ضامن بن جاتی ہے۔ یہ موت ایمان کے زندہ سلامت رہنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ یہ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ جرائم، دھوکا بازی اور ظلم و جور کا دور دورہ ہے۔ یہ ثابت کرتی ہے کہ حق و صداقت کو پامال کیا جارہا ہے۔ یہ ان اقدار کی موجودگی کا پتا دیتی ہے جو تباہ ہو کر فراموش ہو چکی ہیں۔ یہ سیاہ استبداد کے خلاف سُرخ احتجاج ہے۔ یہ اس خاموشی کو توڑنے والا غیظ و غضب سے لبریز نعرہ ہے جو زبانیں کاٹ کر مسلّط کر دی گئی ہو۔

شہادت اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے جسے اہلِ غرض تاریخ کے اوراق میں چھپائے رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اس چیز کا نشان ہے جس کا زندہ رہنا ضروری ہے۔ یہ اس کے متعلق گواہی ہے جو خاموش اور پراسرار وقت میں ہو رہا ہے۔ درحقیقت شہادت ہستی کا واحد سبب، موجودگی کا واحد نشان، حملے اور دفاع کا واحد ذریعہ اور مقاومت کا واحد طریقہ ہے تاکہ ایک ایسی حکومت کے زمانے میں جس میں جھوٹ اور ظلم کا دور دورہ ہو حق و صداقت اور عدل و انصاف زندہ رہ سکیں۔ اس ظالم حکومت نے دینِ حق کے تمام مراکز مسمار کر دیے ہیں۔ اس کا دفاع کرنے والوں اور اس کے عقیدتمندوں کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ انسانیت ہر لحظہ روبہ انحطاط ہے اور اسے موت کا خطرہ ہے۔ اب ایک معجزے کی ضرورت ہے اور یہ معجزہ شہادت ہی انجام دے سکتی ہے یعنی یہ کہ کوئی اٹھے اور گواہی دے۔

ہجرت کو ساٹھ سال گزر چکے تھے۔ اب اس بات کی ضرورت تھی کہ اس قبرستان جیسی تیرہ و تار اور خاموش فضا میں ایک نجات دہندہ ابھرے۔ چنانچہ تاریخ کی انسانیت سے نفرت نے امام حسینؑ کے کندھوں پر جو ذمّہ داری ڈال دی تھی اسے محسوس کرتے ہوئے وہ بلا جھجک مکّہ سے اپنی شہادت گاہ کی طرف

روانہ ہوئے۔ وہ جانتے تھے کہ تاریخ ان کا انتظار کر رہی ہے۔ وقت جس پر رجعت پسندوں اور مشرکوں نے قبضہ جما رکھا تھا ان کے لیے چشم براہ تھا اور دیکھ رہا تھا کہ وہ کیسے آگے بڑھتے ہیں۔

اسیری میں مبتلا لوگوں کو جو غلاموں کی طرح بے حس و حرکت اور خاموش ہو چکے تھے اِمام علیہ السّلام کی تحریک اور ان کے شعار کی اشد ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں جس مشن پر اب شیطانی ہاتھوں نے قبضہ کر رکھا تھا وہ آپ کی موت کا تقاضا کر رہا تھا تاکہ وہ تباہی اور بربادی کی گواہی دے سکیں۔ کہا جاتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے آپ سے فرمایا تھا: "خدا تمہیں شہید ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔"

ہمارے فلسفۂ بشریت میں شہادت کے ایک خاص معنی بھی ہیں۔ انسان کی تخلیق ملکوتی اور شیطانی صفات کے مجموعے سے عبارت ہے۔ یہ روح اور مٹی کا اتحاد ہے۔ مذہب اور اس سے جنم لینے والے تمام اذکار، عبادات، احکام، نیک اعمال اور علم و دانش کی نوعیت جِدّ و جُہد اور ان مشقتوں کی ہے جو انسان اپنی بری صفات کو دبانے اور ان پر نیک صفات کو مسلّط کرنے کے لیے عمل میں لاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ شیطانی فِطرت کو ملکوتی فطرت کے تابع کرنے کی کوششیں ہیں لیکن شہادت وہ عمل ہے جو انسان اچانک اور ایک انقلابی طریقے سے بجا لاتا ہے اور اپنے نفس کو محبّت اور ایمان کی حرارت سے گداز کر کے اسے ایک نور اور ایک روحانی ہستی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک شہید کو غسل اور کفن کی کوئی حاجت نہیں ہوتی اور قیامت کے دن اس سے کوئی حساب کتاب نہیں لیا جائے گا۔ شہید اپنی موت سے پہلے ہی اپنے خطاکار اور گنہگار نفس کو قربان کر دیتا ہے اور موت کے

بعد گواہی دینے کے لیے اٹھتا ہے۔

الغرض دوسرے مکاتب کے برعکس جو شہادت کو ایک حادثہ، ایک الجھاؤ اور ایک ایسی موت سمجھتے ہیں جو ایک دلاور شخص پر مسلّط کر دی گئی ہو۔ ہماری تہذیب شہادت کو ایک مقام، ایک درجہ اور ایک رتبہ قرار دیتی ہے۔ یہ حصول مقصد کا ذریعہ نہیں بلکہ بجائے خود ایک مقصد ہے۔

یہ ایک تکمیل ہے۔ یہ ایک بلند پروازی ہے۔ یہ بجائے خود انسانیت کی بلند ترین چوٹی پر پہنچنے کے راستے کی درمیانی منزل ہے اور یہ ایک تہذیب ہے۔

تمام ادوار میں جب ایک دین اور ایک نظریے کے پیرو طاقت حاصل کرتے ہیں وہ اپنی آبرو اور جانوں کی حفاظت جہاد کے ذریعے کرتے ہیں لیکن جب وہ کمزور ہو جاتے ہیں اور انہیں جدوجہد کے ذرائع میسر نہیں ہوتے وہ اپنی جانوں، نقل و حرکت، عقیدے، عزت و آبرو، مستقبل اور تاریخ کی حفاظت شہادت کے ذریعے کرتے ہیں۔ شہادت ہر دور اور ہر نسل کے انسانوں کو اس امر کی دعوت دیتی ہے کہ اگر تم دشمن کو قتل نہیں کر سکتے تو خود موت کو گلے لگا لو۔

دوسرا خطبہ

ایک مناجات

میں عموماً اپنی تقریر کے بعد دعا نہیں مانگا کرتا کیونکہ میں پورے عجز و انکسار کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ میں دعا مانگنے کے قابل نہیں ہوں لیکن خواہ کوئی کچھ بھی کہے اس وقت میں آپ کی اجازت سے مناجات کے چند جملے اس سلسلے میں کہنا چاہتا ہوں کہ حالات کی صورت کیسی ہونی چاہیے جبکہ وہ ویسی نہیں ہے۔

ہماری دعاؤں کی کتابوں میں بتایا گیا ہے کہ دعا ایسے مانگنی چاہیے جیسے ایک بچہ اپنے باپ سے گفتگو کرتا ہے۔ دعا جتنی بے ساختہ ہوگی اتنا ہی اس کی قبولیت کا امکان ہوگا۔

عزیز دوستو! ہم بڑے مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ میری تمام تر امیدیں اور آرزوئیں تم نوجوانوں سے وابستہ ہیں۔ جو لوگ پختہ عمر کے ہیں وہ کسی نہ کسی مقام پہ پہنچ چکے ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ ہیں اور معاشرے میں ان کی کوئی نہ کوئی حیثیت

ہے۔ جو لوگ دولتمند ہیں وہ معاشرے میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور ان کی ذمہ داری اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ جو کچھ انہوں نے سمیٹ لیا ہے اس کی حفاظت کریں لیکن خوش قسمتی سے تم لوگ جو ابھی تک ان چیزوں سے محروم ہو ہماری فلاح کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتے ہو ورنہ ہم معدوم ہو جائیں گے اور فراموش کر دیے جائیں گے۔

اے پروردگار! تو وہ ہے جس نے اولادِ آدم پر اپنا کرم کیا۔ تو وہ ہے جس نے اپنی امانت کا بوجھ آدمؑ کی اولاد کے کندھوں پر ڈالا۔ تو وہ ہے جس نے اپنی کتاب کی تعلیم دینے اور عدل قائم کرنے کے لیے اپنے نبیوں کو مبعوث کیا۔ تو وہ ہے جو کہتا ہے کہ بڑائی صرف تیرے لیے، نبیوں کے لیے اور مومنوں کے لیے ہے۔ ہم سب تیرے بندے ہیں۔

ہم تجھ پر اور تیرے نبیوں کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم آزادی، آگاہی، عدل اور بڑائی چاہتے ہیں۔ ہمیں یہ چیزیں عطا فرما کیونکہ ہمیں ان کی سخت ضرورت ہیں۔ ہم غلامی، جہالت اور ناتوانی کا یوں کبھی شکار نہیں ہوئے جیسے کہ اب ہو رہے ہیں۔

اے ان لوگوں کے کارساز جو محروم ہیں! تو وہ ہے جس نے ہمیشہ محروم، مجبور، مقہور، مظلوم اور ناتواں انسانوں پر اپنی رحمت نازل فرمائی۔ ہم جیتے جی جہنم میں ہیں۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم اٹھیں، بنی نوع انسان کی رہنمائی کریں اور زمین کے وارث بن جائیں مُستضعِفین تیرا وعدہ پورا ہونے کے منتظر ہیں۔ تو تمام بنی نوع انسان کا خالق اور پروردگار ہے لیکن اس وقت صرف محروم عوام تیری عبادت اور حمد و ثنا کرتے ہیں۔

خداوندا! تو نے تمام فرشتوں سے آدمؑ کو سجدہ کرایا لیکن اب آدمؑ کی

اولاد کو زمین کے شیطانوں کے سامنے سجدہ کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

خداوندا! اولادِ آدمؑ کو اس صدی کے بتوں کی غلامی سے نجات دے جنہیں ہم نے خود بنایا ہے۔ ہماری مدد کر تاکہ ہم تیری بندگی اور فرمانبرداری میں فلاح پائیں۔

اے پروردگار! ان لوگوں کو تباہ و برباد کر جو تیری نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں، تیرے نبیوں کو قتل کرتے ہیں اور دنیا پر اپنا تسلّط جمائے ہوئے ہیں اور ان لوگوں کو بھی تباہ کر جو عوام کے مفادات سے غداری کرتے ہیں۔ یا اللہ! لوگوں کو عدل و انصاف کی راہ دکھا۔

خداوندا! ہمارے دینی علماء کو احساسِ ذمہ داری، عوام کو عقل، اہلِ ایمان کو آگاہی اور شعور، ذی فہم لوگوں کو یقین، نیکوکاروں کو ادراک، بیکسوں کو جذبہ و جوش، عورتوں کو عصمت و فراست، مردوں کو آبرو، بوڑھوں کو سمجھ بوجھ، نوجوانوں کو کھرا پن اور استادوں اور طالب علموں کو روشن خیالی عطا فرما۔ جو سو رہے ہیں انہیں جگا دے۔

پروردگار! جو لوگ جاگ چکے ہیں انہیں قوتِ ارادی بخش، ہمارے مبلغوں کو سچائی کے جذبے سے سرشار کر، دیندار لوگوں کے عقیدے میں پختگی پیدا کر، اہلِ قلم کو احساسِ ذمہ داری دے، فنکاروں میں محنت کی عادت پیدا کر، شاعروں کو قوتِ ادراک عطا کر، اسکالروں کو ہدف مرحمت عطا فرما اور جو لوگ ہمت ہار چکے ہوں انہیں امید کی روشنی دکھا۔

ہمارے محروموں کو قوت عطا کر اور قدامت پسندوں کو جھنجھوڑ دے۔ جو بیٹھ گئے ہیں انہیں اٹھنے کی ہمت بخش، جو ساکن ہو گئے ہیں انہیں حرکت میں لا۔ اے پروردگار ہمارے مردوں کو زندگی، نابیناؤں کو بینائی، جو خاموش

کر دیے گئے ہیں انہیں قوّتِ گویائی، تیری اطاعت اور محمدؐ اور آلِ محمدؐ کی محبّت سے سرشار مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو اتحاد کی نعمت سے سرفراز فرما۔ حاسدوں کے دلوں سے حسد دور کر، متکبروں کو عدل و انصاف کا پابند بنا، بدزبان لوگوں کو تہذیب بخش، ہمارے مجاہدین کو صبر دے۔ ہمارے عوام کو ذوقِ آگاہی دے اور ہماری قوم کو ثابت قدم رکھ۔ ہمیں قوّتِ ایثار دے اور فلاح اور خودداری کی فضیلت سے آشنا کر۔

اے ربِّ کعبہ! اِس بات کی اجازت نہ دے کہ تیرے وہ ایماندار بندے جو دن رات تیری عبادت کرتے ہیں اور تیرے خلیل حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کیے ہوئے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں جہالت اور کفر کے شکنجے میں کسے جائیں اور موجودہ دور کے نمرودوں کے غلام بن جائیں۔

اور اے خاتم النبیّینؐ! اے محمد مصطفیٰؐ! اے علم و دانش، آزادی اور قوّت کے پیامبر! آپ کے گھر کو آگ لگا دی گئی ہے اور وہ پھیل رہی ہے۔ ایک ہلاکت خیز طوفان مغرب سے آپ کی سرزمین کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آپ کی امت صدیوں سے ذلت اور خواری کی نیند سو رہی ہے اسے جگائیے، جیساکہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے: "اٹھیے اور انہیں یاددہانی کرائیے۔"

خدارا پھر خبر لے اپنی امت کی مرے آقا
تو پھر بگڑی بنا دے اپنی امت کی مرے آقا

اور اے ابوتراب! اے علی علیہ السلام! آپ اللہ کے شیر اور بندوں کے مولا ہیں۔ آپ بے نوا، مستضعفین اور مظلوموں کے حامی اور عدل و انصاف کے پیکر ہیں۔ آپ محبت اور آزادی کی دنیا کے تاجدار ہیں۔ ہم آپ کو جاننے کے قابل نہیں رہے۔ ظالموں نے ہمارے دلوں سے آپ کو پہچاننے کی صلاحیت

چھین لی ہے لیکن آپ سے محبّت ابھی تک زندہ ہے۔ اس نے ہمارے ضمیر کی گہرائیوں اور ہمارے دل کے پردوں میں آگ بھڑکا رکھی ہے۔ آپ اپنے شیدائیوں کو ذلّت میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ آپ تو وہ ہیں جو اسلامی مملکت میں رہنے والی ایک یہودی عورت پر رتی بھر ظلم برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب ذرا دیکھیے تو سہی کہ مسلمان یہودیوں کے ظلم وستم کی چکّی میں پس رہے ہیں۔ یا علیؑ! آپ کی ذوالفقار کی ایک ضرب سب عابدوں کی قیامت تک کی عبادت سے افضل ہے۔ ہم پر کرم ہوگا اگر اس تلوار کا ایک اور وار کر دیجیے۔

اور اے آسمانِ شرافت کے چمکتے ستارو! اے بھائی اور بہن! اے حسینؑ ابنِ علیؑ اور اے سیّدہ زینبؑ! آپ دونوں نے اپنی رفیع الشان موت سے انسانیت کو معنی کا جامہ پہنایا اور ایمان کو امید اور زندہ انسانوں کو روح بخشی۔ عاشورا کے المناک دن سے جس کا تصور کرتے ہی انسان کا بدن کانپ جاتا ہے اور دل میں ہُوک سی اٹھتی ہے۔ قوم کے آنسو آج تک نہیں تھمے۔ ہمارے عوام صدیوں سے آپ کے مصائب پر گریہ وزاری کر رہے ہیں۔ کیا یہ درست نہیں کہ محبت آنسوؤں کی زبان میں بولتی ہے؟ ایک پوری قوم طولِ تاریخ میں آپ کا ماتم کرتی رہی ہے اور ہر قسم کا ظلم وتشدد اسے آپ کے نام لینے سے باز نہیں رکھ سکا۔ آپ کے ان شیدائیوں نے آپ کو کبھی نہیں بھلایا اور ان کے دلوں میں آپ کی محبّت کی آگ کبھی مدھم نہیں ہوئی۔ ظالموں کے تازیانوں کی ہر ضرب نے ان کے دلوں اور جسموں پر آپ کی محبت کے نقوش گہرے کر دیے ہیں۔

اور اے سیّدہ زینب بنتِ علیؑ! آپ جو مولا علیؑ کی زبان رکھتی ہیں اپنی قوم سے خطاب فرمائیں۔ آپ کی ہمت اور استقلال نے تو ہم لوگوں کو استقامت کا سبق دیا ہے۔ ہماری عورتوں کو اپنے دلوں میں محبت کا درد

جگانے کے لیے آپ کی ولولہ انگیز خطابت کی بے حد ضرورت ہے۔ انہیں اس زمانے میں جتنی شدید آپ کی ضرورت ہے اتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ ایک طرف تو انہیں جہالت نے ذلت اور غلامی میں جکڑ رکھا ہے اور دوسری طرف مغرب انہیں ایک خفیہ غلامی اور جدید قسم کی ذلت اور خواری کی جانب کھینچ رہا ہے جس کے نتیجے میں وہ آپ سے بھی اور خود اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ آپ ان کی مدد فرمائیں تاکہ وہ پرانے اور نئے احمقانہ طور طریقوں، فاسد روایتوں اور دعوتوں اور پرانی فرسودہ رسموں اور نئی تفریحات کے خلاف علَم بلند کریں۔

انہیں وہی کلمۂ حق بلند کرنے کی ہمت عطا کریں جو آپ نے بلند کیا تھا اور جس کی صدائے بازگشت ایک ظلم اور خوف سے معمور شہر کے کونے کونے میں سنی گئی تھی اور جس نے مکر و فریب کے قصرِ خضراء کے ستونوں کو لرزا دیا تھا۔ انہیں اس قابل بنائیں کہ وہ اپنے اندر ایک انقلاب برپا کریں اور اس کی مدد سے مکار مکڑی کے اپنے اردگرد بُنے ہوئے جالے کو توڑ پھینکیں۔

انہیں اس خطرناک آندھی کا مقابلہ کرنا سکھائیں جو اَب چلنے لگی ہے۔ اس نظام کو ملیامیٹ کر دیجیے جو اسے ہوس پرستوں کا کھلونا اور تفریح کا سامان بنا کر ذلیل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اسے اپنی قیادت بخش کر حرم کی پرانی اور قابلِ نفرت بازار کی نئی غلامی سے نجات دلائیے۔

اے سیّدہ زینبؑ! اے وہ جو کہ علی علیہ السّلام کی زبان ہیں۔ جنہوں نے حسینؑ کے مشن کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا۔ جنہوں نے زنجیر و سلاسل کے باوجود کربلا سے واپسی پر شہیدوں کا پیغام لوگوں کے کانوں تک پہنچایا! اے جلیلُ القدر شہزادی! ہم سے کلام کیجیے۔

آپ ہمیں یہ نہ بتائیں کہ آپ پر کیا بیتی، یہ نہ بتائیں کہ آپ نے اس سرخ صحرا میں

کیا دیکھا اور دشمنان دین کن کن جرائم کے مرتکب ہوئے۔

آپ ہمیں یہ بھی نہ بتائیں کہ اس دن خدا نے اپنی پیدا کی ہوئی بہترین قدریں اور عظمتیں فرات کے کنارے کس طرح ظاہر کیں اور فرشتوں کو دکھائیں تاکہ انہیں پتا چلے کہ ان سے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیوں کرایا گیا تھا۔

آپ یہ نہ بتائیں کہ اس دن آپ پر کیا گزری۔ دوستوں اور دشمنوں نے کیا کیا کردار ادا کیے۔

اے امام حسینؑ کے انقلاب کی پیغامبر! یہ باتیں ہم سب جانتے ہیں۔ ہم نے یہ سب کچھ سُن رکھا ہے۔ آپ نے شہیدوں کا پیغام لوگوں تک پہنچایا ہے۔ آپ خود ایک شہید ہیں جنہوں نے اپنے الفاظ کی تخلیق اپنے خون کے قطروں سے کی۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ کے بھائیؑ نے اپنے خون کے ہر قطرے کے ذریعے کلام کیا۔

لیکن آپ ہمیں یہ بتائیں کہ ہم کیا کریں؟ آپ ہمارے مصائب پر نظر ڈالیں اور ہمارے دکھوں میں شریک ہوں۔ فقط آپ ہی ہماری مصیبتوں پہ آنسو بہا سکتی ہیں۔ آپ اپنے گرامی قدر بھائیؑ کے پیغام کی امین ہیں جو کربلا سے رخصت ہوتے ہوئے آپ نے تمام آئندہ نسلوں تک پہنچایا۔

اے بنتِ علیؑ! اے اسیروں کے کاروان کی سالار! براہِ کرم ہمیں بھی اس کاروان کے ساتھ لیتی چلیں۔

اے حسینؑ ابن علیؑ! میں آپ سے کیا عرض کروں۔ اس اندھیری رات میں جب کہ مَیں سمندر کے عین وسط میں ہوں، لہریں بپھری ہوئی ہیں اور طوفان بپا ہے۔ مَیں آپ سے کیا کہوں؟

آپ وہ سراجِ منیر ہیں جس کی مدد سے ہم راستہ دیکھ سکتے ہیں۔ آپ

کشتیٔ نجات ہیں۔ آپ کا جو خون بہایا گیا تھا وہ جہاں کہیں بھی کوئی مکر و فریب سے کام لے خود بخود جوش میں آجاتا ہے۔ وہ وقت کی ندی میں بہتا ہوا نسل در نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہ وہ خون ہے جو زرخیز زمین کو سیراب کرتا ہے۔ زمین کی تہ میں بیج کو نشو و نما دیتا ہے اور ایک خشک پودے کو تر کر کے وجود عطا کرتا ہے۔

آپ شہادت کے عظیم استاد ہیں۔ آپ کی شہادت کے نور سے ہمارے تاریک اور ویران گھر جگمگا اٹھتے ہیں۔ آپ کے متحرک خون کے قطرے ہماری خشک اور نیم مردہ ندیوں میں بہتے ہیں۔ براہِ کرم اس تپتے ہوئے صحرا کی تھوڑی سی آگ ہمارے ٹھنڈے اور یخ بستہ موسمِ سرما کو بھی عنایت کر دیجیے۔

آپ نے اپنے لئے گلرنگ موت کا انتخاب کیا تاکہ آپ کے شیدائی ذلت کی موت سے بچ جائیں۔ اپنے لہو کے ہر قطرے کے ساتھ آپ ایک قوم کو زندگی بخشتے ہیں۔ تاریخ کے دل کو دھڑکن عطا کرتے ہیں۔ ہر دور کی دل شکستہ نسل کو جوش و خروش بخشتے ہیں اور زندگی کا ذوقِ امید اور محبت مہیا کرتے ہیں۔

ہمارے ایمان، ہماری قوم، ہمارے موجودہ دور کے لوگوں اور آئندہ کی تاریخ سبھی کو آپ کی اور آپ کے خون کی ضرورت ہے۔

تبصرا خطبہ

شہادت کے بعد

بہنو اور بھائیو!

اب شہداء تو بظاہر موت سے ہمکنار ہو چکے ہیں لیکن ہم جو درحقیقت مردہ ہیں ظاہر بین آنکھ کے لیے زندہ ہیں۔ شہیدوں نے ہمیں اپنے زرّیں اقوال سے نوازا لیکن ہم نے ان کے الفاظ پر توجہ نہیں دی۔ وہ بڑے دلاور انسان تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ زندہ رہنا ممکن نہیں رہا تو انہوں نے اپنے لیے موت کا انتخاب کر لیا۔

وہ تو رخصت ہو گئے مگر ہم کمال ڈھٹائی سے موجود ہیں۔ ہم صدیوں سے موجود رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ لوگ ہم پر ہنسیں کہ ہم جو ذلت اور زبوں حالی کے نمونے ہیں امام حسینؑ اور حضرت زینبؑ کے لیے آہ و بکا کر رہے ہیں جو عظمت اور جلال کے مظہر ہیں۔

یہ بھی تاریخ کا ایک جبر ہے کہ ہم جو خوار و زبوں ہیں ان عظیم ہستیوں کی خاطر

اشک فشانی میں مصروف ہیں۔

آج شہداء اپنے خون کے ساتھ اپنے پیغام کا اعلان کر رہے ہیں۔ وہ ہمارے سامنے بیٹھے ہیں تاکہ جو بیٹھے ہوئے ہیں انہیں اٹھنے کو کہیں۔

کربلا آج بھی ہے ایک لگاتار پکار
ہے کوئی پیروئ ابنِ علیؑ پر تیار
عصرِ حاضر میں یزیدوں کا نہیں کوئی شمار
تم مصلّوں پہ دوزانو ہو، مسلّح اَشرار
شورِ ماتم میں کہیں تیغ کی جھنکار نہیں
لب پہ نالے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار نہیں

ہماری تہذیب، ہمارے مذہب اور ہماری شیعہ تاریخ میں انسانیت نے بڑی طاقتور اور حیات بخش ہستیاں پیدا کی ہیں جنہوں نے تاریخ کو زندگی اور زندگی کو ولولہ بخشا ہے اور ایسے روحانی سبق دیے ہیں جو انسان کو ترقی کرنا اور اللہ تعالیٰ کا قرب پانا سکھاتے ہیں۔ الٰہی سرمائے کا یہ گرانبہا ورثہ خوار اور زبوں لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور ابھی تک پوشیدہ ہے۔

ہم اس عظیم ترین متاع کے وارث ہیں جو جہاد اور شہادت کے ذریعے اور انسانی اقدار کی خاطر عظیم ترین قربانیاں دے کر جمع کی گئی ہے۔ ہم ان سب چیزوں کے وارث ہیں اور ہم پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم عالم انسانیت کے لیے ایک مثالی امت ثابت ہوں جیسا کہ ہمیں قرآن مجید میں بتایا گیا ہے:

"ہم نے تمہیں ایک مثالی نمونے کی امت قرار دیا ہے تاکہ
تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو جیسے کہ رسولؐ تم پر گواہ ہیں"

لہٰذا اس گراں قدر سرمائے کی بنا پر ہم اپنے شہیدوں، جانبازوں،

پیشواؤں اور سالاروں کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ہم اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اپنی "کتاب" کے وفادار رہیں اور ایک مثالی قوم بنیں تاکہ ساری دنیا کے لوگوں پر گواہی دے سکیں۔

یہ ایک بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔ ہم لوگ جو عام زندگی بھی صحیح طریقے سے نہیں گزار سکتے انہیں اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے کہ عالمِ انسانیت کو زندگی بخشیں اور اسے حرکت میں لائیں۔ یا اللہ! اس میں کیا راز پوشیدہ ہے؟ کیا ہم جو برائیوں میں گرفتار ہیں اور جانوروں جیسی زندگی گزار رہے ہیں اس قابل ہیں کہ ان مردوں، عورتوں اور بچّوں کا ماتم کریں اور ان کے لیے مجالسِ عزا برپا کریں جنھوں نے کربلا میں شہادت کو عملی طور پر ثابت کیا اور ہمیشہ کے لیے تاریخ، آزادی اور خدا کے سامنے اس امر کے گواہ ہیں؟

اے پروردگار! امام حسینؑ کے خاندان پر یہ کیسا نیا ظلم کیا جا رہا ہے؟ شہیدوں نے اپنا کام اختتام تک پہنچا دیا ہے اور اب آدھی رات کے وقت ہم ان کا ماتم کر رہے ہیں اور یہ اعلان کر رہے ہیں کہ ان کا کام ختم ہو گیا ہے۔ آپ بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ حسینؑ کے لیے آہ و بکا کی شکل میں اور حسینؑ سے محبت کی خاطر ہم کس طرح یزید سے تعاون کر رہے ہیں کیونکہ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ قصّہ ختم ہو جائے۔ شہیدوں نے اپنا کام ختم کر دیا ہے اور خاموش ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک نے اپنا کردار بڑی پختگی سے ادا کیا ہے۔

معلّم، مؤذن، نوجوان، بچے، بوڑھے، عورتیں، آقا اور خادم سبھی ایک ایسی جماعت کے نمائندے ہو سکتے ہیں جو زندہ موت کا انتخاب کرتی ہے۔ امام حسینؑ کے بچے سے لے کر ان کے بھائی تک، ان کے خادم سے لے کر خود ان تک، قرآن کے قاری سے لے کر کوفہ کے بچوں کے معلّم تک، مؤذن سے لیکر

باہمی قرابت داروں اور غیروں تک، معاشرے کے سربرآوردہ اشخاص سے لے کر عامیوں تک ان شہیدوں نے دو کارنامے انجام دیے۔ وہ شہادت کے روبرو بھائیوں کی طرح یکساں طور پر ثابت قدم رہے تاکہ تاریخ کے مردوں، عورتوں، بچّوں، بوڑھوں اور جوانوں کو یہ بتا دیں کہ: اگر وہ زندہ رہ سکیں تو کیسے زندہ رہیں اور اگر اس طرح زندہ نہ رہ سکیں تو کیسے مریں؟

ان شہداء میں سے ہر ایک اپنے طبقے کا نمائندہ تھا اور ہر ایک نے ایک ہی مقصد (شہادت) کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنے لفظوں سے نہیں بلکہ اپنے خون سے گواہی دی۔ انہوں نے انسانی تاریخ کی عدالت میں جو انسان کی تاریخ متعین کرتی ہے مروجہ نظام کو مردود قرار دیا۔ یہ وہ نظام تھا جو طریق کار، اقتصادیات، مذہب، آرٹ، فلسفہ، خیالات، احساسات، اخلاقیات اور انسانیت کو اس انداز میں استعمال کرتا تھا کہ نظام کی خاطر عوام کو قربان کر دیا جائے۔ انہوں نے اپنی شہادت سے لوگوں کی ان تمام جماعتوں اور انسانی قدروں کو مردود قرار دیا جو ایک ظالم اور مجرم حکومت کے لیے سہارے کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

تاریخ کا فقط ایک حکمران ہے ـــــ ایک ظالم جو تاریخ پر حکومت کرتا ہے ـــــ ایک جلاد جو شہیدوں کو وجود میں لاتا ہے۔ تمام تر تاریخ میں بہت سے لوگ اس جلّاد کے ہاتھوں قربان ہوئے ہیں۔ اس جلاد کے تازیانے نے بہت سی عورتوں کو خاموش کیا ہے۔ کئی ویران جگہیں خون کی بدولت آباد ہوئی ہیں۔ تمام ادوار میں بھوکوں، غلاموں، عورتوں، بچّوں، مردوں، دلاوروں، خدمتگاروں اور معلموں کا قتلِ عام کیا گیا ہے۔

اب امام حسینؑ اپنی ساری پونجی لے کر دریائے فرات کے کنارے

پہنچے ہیں تاکہ تاریخ کی موجودگی میں ان لوگوں کے بارے میں گواہی دیں جن پر طولِ تاریخ میں ظلم کیا گیا ہے اور جنہیں اس جلاد نے سزا دی ہے جو تاریخ پر حکومت کرتا ہے۔

وہ اپنے بیٹے علی اکبرؑ کے ساتھ اس امر کی گواہی دینے آئے ہیں کہ اس جلّاد ضحّاک نے تاریخ کے تمام ادوار میں کتنے نوجوانوں کا بھیجا کھایا ہے۔

وہ اس امر کی گواہی دینے آئے ہیں کہ ظالموں اور مجرموں کے دَورِ حکومت میں ایک سورما اپنی جان کی قربانی کس طرح دیتا ہے۔ وہ اپنی بہن زینبؑ کے ساتھ اس نظام کے بارے میں گواہی دینے آئے ہیں جس نے ہمیشہ تاریخ پر حکومت کی ہے اور جس کے مطابق عورتوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں ـــــ یا تو غلامی قبول کر کے حرم میں رہیں اور یا پھر اگر آزادی کی طلبگار ہوں تو شہید بن کر رہیں اور اسیروں کے قافلے کی قیادت کریں۔

وہ اپنے شیر خوار بچے علی اصغر کے ساتھ اس امر کی شہادت دینے آئے ہیں کہ ظالم حکومت اور ستمگر جلاد کے دل میں شیر خوار بچے کے لیے بھی کوئی رحم نہیں ہوتا۔

امام حسینؑ اپنی پوری ہستی کے ساتھ تاریخ کی فوجداری عدالت میں ان لوگوں کے بارے میں گواہی دینے آئے ہیں جو شہید کر دیے گئے ہیں اور جو بغیر کسی دفاع کے خاموشی سے موت سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

اب امام حسینؑ کی شہادت کے ساتھ اور ان کی عزیز ترین متاع کی قربانی اور تمام امکانات کے خاتمے کے ساتھ عدالت کی کارروائی ختم ہو گئی ہے۔ انہوں نے اپنے عظیم مشن کی تکمیل کر دی ہے۔

عزیزانِ گرامی! جو شیعیّت ہم دیکھ رہے ہیں اس میں جو شخص خالص بیدارانہ شیعیّت کے بارے میں بحث کرے اس کے دشمنوں کے ہاتھوں شکست

کھانے سے پہلے اس کے دوست ہی اسے قربان کر دیتے ہیں۔ اس میں ایک بہت اہم اور عظیم سبق اور پیغام ہے اور بہت بڑی اور الٰہی اقدار پوشیدہ ہیں۔ جو بھی معاشرے، قوموں، نسل اور تاریخ کو زندگی کی روح بخشے وہ ایک بڑا قیمتی وسیلہ ہے۔

شیعیّت کی تاریخ میں موجود سب سے اہم حیات بخش وسیلہ شہادت ہے جیسا کہ جلال احمد نے کہا ہے:

"ہم نے شہادت کی روایت کو بھلا دیا ہے اور اپنے آپ کو فقط شہیدوں کے مزاروں کا مجاور بنا دیا ہے۔ ہم ذلّت کی موت کے حامل ہیں۔"

ہم امام علیؑ، امام حسینؑ اور حضرت زینبؑ کے شیعہ یعنی شہیدوں کے پیرو بننے کی بجائے ہمیشہ صرف ماتم کرتے رہے ہیں۔ ہم نے کس کمال ہوشیاری سے امام حسینؑ اور ان کے عظیم اور زندۂ جاوید ساتھیوں کے پیغام کو بدل دیا ہے! اس پیغام کے مخاطب تمام بنی نوعِ انسان ہیں۔

جب امام حسینؑ نے دیکھا کہ ان کے سب ساتھی قتل ہو چکے ہیں اور اب ان کے سامنے دشمن کی قابلِ نفرت اور غارتگر فوج کے علاوہ اور کوئی نہیں تو آپ نے فرمایا: "کیا کوئی ہے جو ہماری مدد کرے؟"

اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ کے عِلم میں نہیں تھا کہ اب آپ کی مدد کرنے والا کوئی نہیں؟ درحقیقت امام عالی مقام نے یہ سوال انسان کی مستقبل کی تاریخ سے کیا ہے۔ اس سوال کے مخاطب مستقبل اور ہم لوگ ہیں۔ اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسینؑ اپنے شیدائیوں سے کیا توقع رکھتے ہیں۔ اس سوال کے ساتھ انہوں نے ان تمام لوگوں کو دعوت دی ہے جن کے

دلوں میں شہادت اور شہیدوں کے لیے عزت موجود ہے۔

لیکن ہم نے امامؑ کی دعوت، ان کی جانب سے مدد کی توقع اور ان کے پیغام کو جو ہر دور اور ہر نسل کے شیعہ سے مدد کا طالب ہے کما حقّہٗ اہمیت نہیں دی۔ اس کی بجائے ہم دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ امام عالی مقام کو فقط آہ و بکا اور آنسوؤں کی ضرورت ہے اور ان کا کوئی اور پیغام نہیں۔ وہ فوت ہو چکے ہیں اور انہیں گریہ و ماتم کی ضرورت ہے اور وہ گواہی دینے والے شہید نہیں ہیں اور ایسی شخصیت بھی نہیں ہیں جنہیں ہر دور میں اور ہر مقام پر پیروؤں کی ضرورت ہو!!

ہر انقلاب کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ اس کا ایک رُخ خون اور دوسرا رُخ پیغام ہوتا ہے۔ شہادت کے معنی گواہی دینے کے ہیں۔ شہید وہ ہوتے ہیں جو اس حق و صداقت کی خاطر جسے دبایا جا رہا ہو اور ان قدروں کی خاطر جنہیں مٹایا جا رہا ہو برضا و رغبت جہاد کر کے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

شہادت کے معنی زندہ و موجود ہونے اور فقط خدا کے حضور میں ہی نہیں بلکہ ہر دور، قرن، وقت اور جگہ کے لوگوں کے سامنے بھی گواہی دینے کے ہیں۔ جو لوگ زندہ رہنے کے لیے ذلت برداشت کرتے ہیں ان کا شمار تاریخ کے خاموش اور ناپاک مُردوں میں ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے بخوشی موت کا انتخاب کیا اور امام حسینؑ کے ساتھ قتل ہونے کے لیے قربان گاہ میں آ گئے۔ اگر وہ اپنی جان بچانا چاہتے تو ان کے پاس سینکڑوں شرعی دلیلیں تھیں۔ تاہم انہوں نے کوئی عذر پیش نہیں کیا اور اپنی جانیں نثار کر دیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا

۱۔ وہ جانباز زندہ ہیں یا وہ لوگ جنہوں نے امام حسینؑ کا ساتھ چھوڑ

دیا اور اپنی جان بچانے کے لیے یزید کی اطاعت اور خوشامد کی ذلت برداشت کر لی؟

۲- وہ لوگ زندہ ہیں جن کے نزدیک زندگی محض ایک چلتے پھرتے جسم کا نام نہیں۔

۳- وہ لوگ زندہ ہیں جو امام حسینؑ کی ہستی کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی ہستی کے ساتھ اُن کی ہستی کی گواہی دیتے ہیں۔

۴- جو اُن لوگوں کو زندہ رہنے کی خاطر گوارا کرتے ہیں مُردہ تصوّر کرتے ہیں۔

وہ اور شہداء اس بات کا برملا اظہار کرتے ہیں اور یہ درس اور پیغام دیتے ہیں کہ ناقابلیت انسان کو ظلم و تشدد کا مقابلہ کرنے کے فریضے سے بری قرار نہیں دے سکتی۔ شہادت اِس دلیل کو تسلیم نہیں کرتی کہ فتح فقط دشمن پر تسلّط حاصل کرنے کا نام ہے۔ شہید وہ ہے جو دشمن پر غلبہ نہ پا سکنے کی صورت میں خود اپنی موت کے ذریعے فتحیاب ہوتا ہے اور اگر دشمن کو شکست نہ بھی دے سکے تب بھی اسے دنیا کی نظروں میں ذلیل ضرور کر دیتا ہے۔

شہید تاریخ کا دل ہوتا ہے۔ جس طرح دل بدن کو خون پہنچاتا ہے ایک شہید بھی تاریخ کو خون مہیا کرتا ہے۔ اگر ایک معاشرہ مر رہا ہو، اس کے ارکان ایمان سے عاری ہوتے جا رہے ہوں، وہ بتدریج موت سے ہمکنار ہونے والا ہو، وہ باطل کے سامنے سر جھکا دے، اس میں احساسِ ذمّہ داری باقی نہ ہو اور اس کی پیداوار اور حرکت رک گئی ہو تو شہید دل کی مانند اس کی خشک، بے جان اور بے حس و حرکت لاشوں کو خون مہیا کرتا ہے۔

ایک شہید کی شہادت کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ وہ ایک نسل کو تازہ ایمان بخشتا ہے اور یوں ہمیشہ موجود اور زندہ جاوید رہتا ہے۔

کون غیر حاضر ہے ؟ امام حسینؑ نے ہمیں اپنی شہادت سے بھی زیادہ اہم ایک اور سبق دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے حج بھی مکمل نہیں کیا اور شہادت کو حج پر فوقیت دی۔ انہوں نے حج مکمل نہیں کیا حالانکہ حج ان کے نانا اور والد کی جدّوجہد کی تجدید ہے اور اس کے بجائے شہادت کا انتخاب کیا۔ انہوں نے حج اس لیے مکمل نہیں کیا کیونکہ وہ تاریخ کے تمام حاجیوں اور حضرت ابراہیمؑ کے تمام ایماندار پیروؤں کو بتا دینا چاہتے تھے کہ اگر امام اور پیشوا نہ ہو تو کوئی ہدف بھی باقی نہیں رہتا اور اگر حسینؑ نہ ہو اور یزید موجود ہو تو اللہ کے گھر کا طواف ایک بت خانے کے طواف سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

جب امام حسینؑ اپنے مناسک حج قطع کر کے کربلا روانہ ہو گئے تو جن لوگوں نے آپ کی عدم موجودگی میں خانہ کعبہ کا طواف جاری رکھا ان کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے کہ وہ معاویہ کے قصرِ خضراء کا طواف کر رہے ہوں کیونکہ شہید وہ ہے جو موجود ہو اور وہ حق و باطل کے تمام منطقوں میں اور ظلم اور عدل کے مابین ہر لڑائی میں موجود ہوتا ہے۔ وہ موجود ہوتا ہے اور اس کی موجودگی کا مقصد بنی نوع انسان کو یہ پیغام دینا ہوتا ہے:

"اگر تم حق و باطل کے میدانِ جنگ میں موجود نہیں تو پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کہاں ہو۔ اگر تم اپنے دور میں حق و باطل کی لڑائی کی گواہی نہ دو تو پھر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کیا کر رہے ہو یعنی خواہ تم نماز پڑھ رہے ہو یا لہو و لعب میں مصروف ہو ایک جیسی بات ہے۔"

"شہادت" حق اور باطل کے درمیان تاریخ کے دائمی میدان جنگ کی گواہی دیتی ہے۔ جہاں تک غیر حاضری کا تعلق ہے وہ تمام لوگ جنہوں نے امامؑ کو تنہا چھوڑ دیا اور شہادت میں ان کا ساتھ نہ دیا ایک دوسرے کے برابر ہیں ــــ خواہ

وہ، وہ لوگ ہوں جو امام حسینؑ کو چھوڑ کر یزید سے مل گئے اور اس کے کارندے بن گئے یا وہ ہوں جو بہشت کے حصول کی خاطر یا حق و باطل کی کشمکش سے دور رہنے کے لیے عبادت میں مشغول ہو گئے اور امامؑ کا ساتھ نہ دیا اور یا وہ ہوں جو خوف کے مارے خاموش رہے۔

جہاں امام حسینؑ موجود ہوں —— اور وہ ہر قرن اور ہر دور میں موجود ہوتے ہیں —— وہاں جو شخص ان کے پہلو بہ پہلو نہ کھڑا ہو وہ بے وفا ہے اور اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آیا وہ مومن ہے یا مشرک اور مجرم ہے یا نیکوکار۔

شیعہ مکتبِ فکر کے ایک اصول کے مطابق ہر فعل کی ماہیت کا انحصار امامت اور پیشوائی پر ہے۔ اس کے بغیر ہر چیز بے معنی ہے۔

امام حسینؑ نے تمام نسلوں کو آگاہ کر دیا ہے کہ وہ ہر دور میں، ہر لڑائی، ہر جہاد اور ہر میدانِ جنگ میں موجود ہوتے ہیں۔ ان کی شہادت کربلا میں اسی لیے ہوئی کہ وہ تمام ادوار اور تمام نسلوں کو اٹھنے کے لیے کہیں۔

کربلا بہر عمل نعرہ زناں ہے اب تک
کربلا گوش بر آوازِ یلاں ہے اب تک
کربلا منتظرِ صف شکناں ہے اب تک
کربلا جانب اِنساں نگراں ہے اب تک
دادِ غم ایک بھی جاں باز نہیں دیتا ہے
کوئی آواز پہ آواز نہیں دیتا ہے

جہاں تک میرا اور آپ کا تعلق ہے ہمارے لیے بڑے دکھ کا مقام ہے کہ ہم —— موجود نہیں ہیں۔

ہر انقلاب کے دو رُخ ہوتے ہیں: ایک خون اور دوسرا پیغام۔

امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے پہلے مشن یعنی خون کا انتخاب کیا۔

شہادت کا دوسرا مشن یعنی بنی نوع انسان تک پیغام پہنچانے کا کام حضرت زینبؑ کے سپرد کیا گیا جو اتنی ہمت اور حوصلے کی مالک تھیں جس سے ہر کوئی سبق حاصل کر سکتا ہے۔ حضرت زینبؑ کا مشن ان کے بھائی کے مشن سے زیادہ سنگین اور مشکل تھا۔ بلاشبہ جن بزرگواروں نے اپنی موت کا انتخاب کیا ان کا اقدام نہایت جرأت مندانہ تھا اور انہوں نے ایک بہت بڑا انتخاب کیا لیکن جو لوگ پیچھے رہ گئے ان کی ذمہ داری بے حد سنگین اور مشکل تھی۔ حضرت زینبؑ پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھیں اور اسیروں کے قافلے کی سربراہی ان کے حصے میں آئی۔ دشمن کی فوج کے دستے ان کے سامنے تھے۔ اپنے بھائی کے مشن کے بارے میں اعلان کرنا اور لوگوں کو اس سے روشناس کرانا ان کی ذمہ داری تھی۔ وہ شہر میں داخل ہوئیں۔ وہ میدانِ جنگ سے آ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے پیچھے شہادت کا ایک سُرخ باغ چھوڑا تھا جس کے سرخ پھولوں کی مہک ان کے لباس سے نکل نکل کر پھیل رہی تھی۔ وہ اس مجرم شہر میں داخل ہوئیں جو طاقت، ظلم اور قتل و غارت کا مرکز تھا۔

انہوں نے ظالموں، زرخرید غلاموں، استبداد کے کارندوں اور جلادوں کے سامنے پورے اطمینان کے ساتھ اور فاتحانہ انداز میں یہ اعلان کیا:

"اے پروردگار! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے ہمارے خاندان کو کریم النفسی اور عظمت عطا فرمائی۔ تو نے ہمیں نبوت اور شہادت کے اعزازات بخشے۔"

حضرت زینبؑ پر ان جانبازوں کا پیغام دنیا تک پہنچانے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی جنہوں نے گواہی دی تھی لیکن اب خاموش تھے۔ ان پر یہ ذمہ داری اس لیے عائد ہوتی تھی کہ وہ پیچھے رہ گئی تھیں اور انہیں ان شہیدوں کی بجائے بولنا

تھا جن کی زبانیں جلادوں نے خاموش کردی تھیں۔

اگر خون کا کوئی پیغام نہ ہو تو تاریخ اس کے بارے میں خاموش رہے گی۔ اگر خون اپنا پیغام تمام نسلوں تک نہ پہنچائے تو جلاد اسے ایک مخصوص وقت اور دور میں مقید کردے گا۔ اگر حضرت زینبؑ کربلا کا پیغام تاریخ تک نہ پہنچاتیں تو کربلا خاموش رہتی اور یہ پیغام ان لوگوں تک نہ پہنچتا جنہیں اس کی ضرورت تھی۔

بنی نوع انسان کے کان ان حضرات کے پیغام سے ناآشنا رہتے جنہوں نے خون کی زبان میں گفتگو کی۔

اسی بنا پر حضرت زینبؑ کی ذمہ داری انتہائی سنگین اور مشکل تھی۔ انکا پیغام تمام عالمِ انسانیت کے لیے تھا۔ ان کا پیغام ان سب لوگوں کے لیے تھا جو امام حسینؑ کی موت پر آنسو بہاتے ہیں جو حسینؑ کے ایمان کی دہلیز پر اپنا سر جھکاتے ہیں اور جن کا عقیدہ اِمام علیہ السّلام کی طرح یہ ہے کہ "زندگی فقط عقیدہ اور جہاد کا نام ہے"۔

حضرت زینبؑ کا پیغام یہ تھا:

تم میں سے جو لوگ بھی اس خاندان سے وابستہ ہیں اور حضرت محمدؐ کے لائے ہوئے دین پر ایمان رکھتے ہیں وہ خواہ کسی دور میں اور کسی جگہ بھی ہوں انہیں چاہیے کہ وہ شہدائے کربلا کا پیغام پورے غور سے سنیں ـــــ ان شہداء کا پیغام جنہوں نے کہا تھا کہ وہی لوگ اچھی طرح جی سکتے ہیں جو اچھی طرح مر بھی سکتے ہیں۔

تم جو توحید الٰہی، قرآن اور علی علیہ السّلام اور ان کے خاندان کے طور طریقوں پر ایمان رکھتے ہو اور تم جو ہمارے بعد آؤ گے غور سے سن لو کہ ہمارے خاندان نے عالمِ انسانیت کو یہ سبق دیا ہے کہ اچھی طرح زندہ کیسے رہا جاتا ہے اور اچھی طرح مرا کیسے جاتا ہے۔

اگر تم دیندار ہو تو تم پر تمہارے دین کی طرف سے ذمّہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک آزاد شخص بھی انسانی آزادی کے سامنے ذمہ دار ہے۔ اپنے وقت کے بارے میں گواہی دو۔ اپنے دور میں حق اور باطل کے مابین کشمکش کے بارے میں گواہی دو۔ ہمارے شہید جہاں کہیں بھی گواہی دیتے ہیں آگاہ، زندہ اور موجود ہوتے ہیں۔ وہ ایک نشان ہیں اور حق و باطل اور انسانیت کے مقدّر کے متعلق گواہی دیتے ہیں"۔

ایک شہید ان سب چیزوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوتا ہے اور ہر انقلاب کے دو رُخ ہوتے ہیں ـــــ خون اور ایک پیغام۔ ہر اس شخص کو جس نے حق و صداقت قبول کرنے کی ذمّہ داری لی ہے اور وہ جانتا ہے کہ شیعہ کا وظیفہ کیا ہے اور انسانی آزادی کا کیا مطالبہ ہے۔ یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ:

کُلُّ یَوْمٍ عَاشُورَا

کُلُّ اَرْضٍ کَرْبَلَا

تاریخ کی دائمی جنگ میں ہر دن عاشورا اور ہر زمین کربلا ہے لہٰذا اگر وہ غیر حاضر نہیں ہونا چاہتا اور ہمیشہ موجود رہنا چاہتا ہے تو اسے دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا:

۱۔ خون کا یا پیغام رسانی کا۔

۲۔ حُسینیت کا یا زینبیت کا

۳۔ امام حسینؑ کی طرح مرنے کا یا حضرت زینبؑ کی طرح زندہ رہنے کا۔

میں حاضرین سے تہہ دل سے معذرت خواہ ہوں۔ وقت نکل چکا ہے اور اب مزید موقع باقی نہیں رہا حالانکہ ابھی کہنے کو بہت کچھ ہے۔ کوئی شخص

ایک تقریر میں امام حسینؑ کا معجزہ اور حضرت زینبؑ کے ہاتھوں اس کی تکمیل کیونکر بیان کرسکتا ہے؟ جو کچھ میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ایک طویل قصّہ ہے لیکن شہداء کی شہادت کے بعد حضرت زینبؑ کا مشن یہ ہے:

جو مر گئے ہیں اُنھوں نے حُسینی عمل انجام دیا ہے
جو زندہ ہیں اُنھیں زینبی عمل انجام دینا چاہیے
جو نہ حُسینی عمل کریں نہ زینبی وہ یزیدی ہیں۔

WORLD SHIA MUSLIM ORGANISATION

لا إله إلا الله

محمد رسول الله

WORLD SHIA MUSLIM ORGANISATION

انقلاب و انقلاب

عزّتِ دستور پر جو سر کٹا سکتا نہیں
خود جو اپنے ہی چراغوں کو بجھا سکتا نہیں
تان کر سینے کو جو میداں میں آ سکتا نہیں
مَوت کو جو اپنے کاندھے پر اٹھا سکتا نہیں

ہاں خود اپنے خون میں کشتی جو کھے سکتا نہیں
وہ حسینؑ ابنِ علیؑ کا نام لے سکتا نہیں

جوشؔ